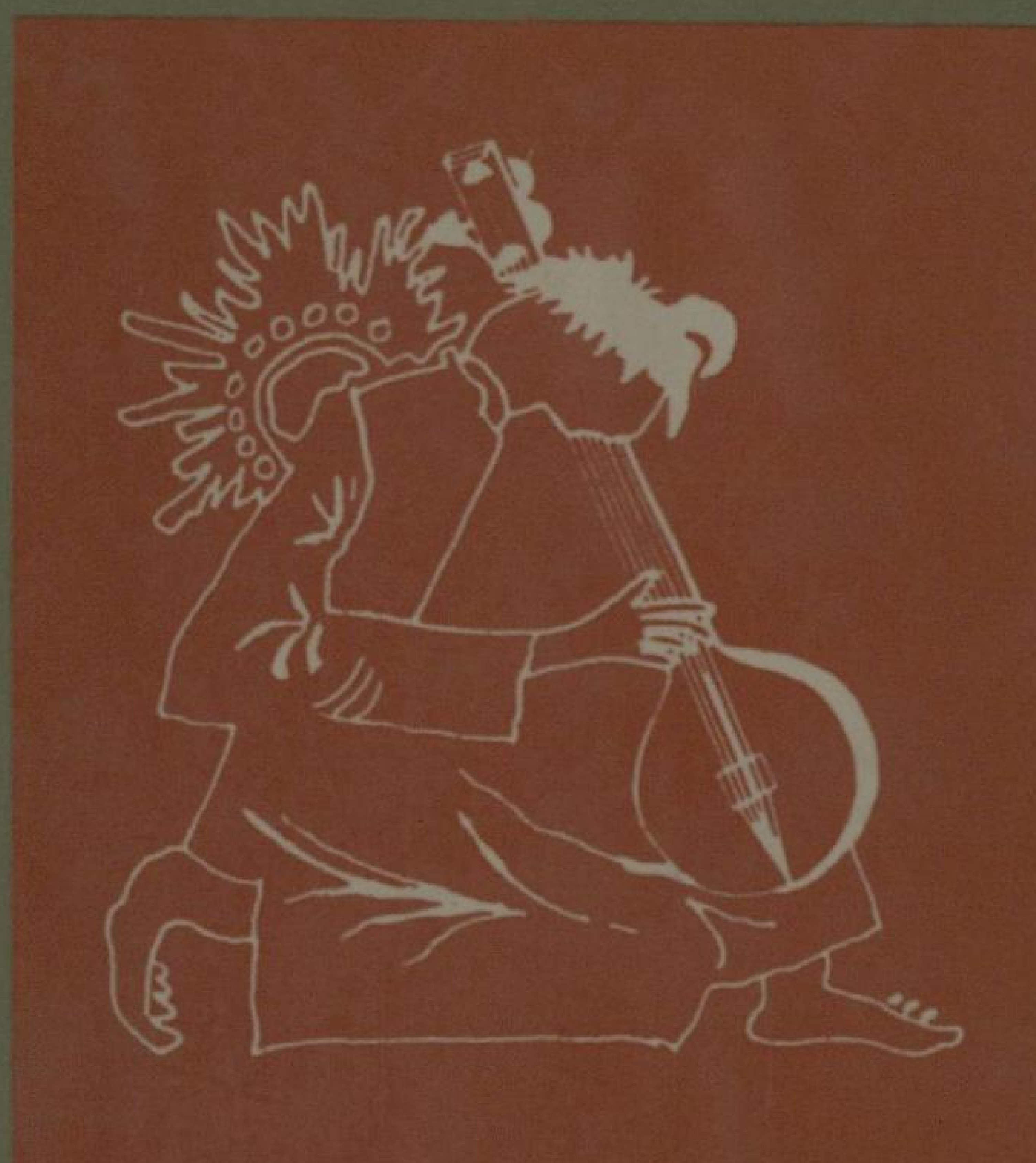
LOK VIRSA PUBLISHING HOUSE
لوک وِرثہ اشاعت گھر



سُورٹھ

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام اور اُردو ترجمہ

سُر سورٹھ

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

منظوم اُردو ترجمہ

آغا سلیم

لوک ورثہ اشاعت گھر

MP–866–01

سلسلہ صُوفی شعرا کا کلام

اُردو ترجمہ :— آغا سلیم

نگران : عکسی مفتی — مدیر : مظہر الاسلام

لوک ورثہ اشاعت گھر پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۴، اسلام آباد

قیمت : ۳۲ روپے

حفیظ پرنٹنگ کارپوریشن، گوالمنڈی، راولپنڈی

فہرست

تعارف

سندھ میں سورٹھ راگ بھی ہے اور لوک داستان بھی - ایک روایت کے مطابق اس لوک داستان کے ایک کردار " سورٹھ " کے نام کی نسبت سے اس راگ کو سورٹھ کہا گیا۔

ایک اور روایت کے مطابق سورٹھ سوارشٹر کی بگڑی ہوئی شکل ہے - سورٹھ کے نام پر اٹھارویں صدی تک کاٹھیاواڑ کے علاقے کو سوراشٹر کہا جاتا تھا لیکن بعد میں اس علاقے میں رہنے والی قوم کاٹھی کے نام کی نسبت سے اس علاقے کا نام کاٹھیاواڑ پڑ گیا۔ کاٹھیاواڑ کے جنوبی ضلعے کا نام آج بھی "سورٹھ" ہے جو سوارشٹر کی ہی بدلی ہوئی صورت ہے - سورٹھ راگ سوارشٹر کا مقبول راگ تھا۔ اسی لیے اسے سورٹھ کہا گیا۔

شاہ عبدالطیف بھٹائی نے اپنے کلام کو مختلف راگوں میں ترتیب دیا۔ ان میں سے کچھ راگ تو کلاسیکی راگوں کے نام پر ہیں اور انہیں کلاسیکی راگوں ہی میں گایا جاتا ہے - کچھ راگوں کے نام موضوعاتی ہیں یعنی ان کے نام موضوع کے اعتبار سے رکھے گئے ہیں اور ان کو مختلف راگوں میں گایا جاتا ہے۔ کچھ راگوں کے نام علاقائی لوک داستانوں پر رکھے گئے ہیں اور ان کو الگ الگ راگوں میں گایا جاتا ہے۔ کچھ وہ راگ ہیں جن کے نام کلاسیکی راگوں پر ہیں لیکن ان میں لوک داستانیں گائی جاتی ہیں۔ شاہ صاحب کا سُر سورٹھ " اس قسم کا راگ ہے جس کا نام تو کلاسیکل راگ پر ہے لیکن اس میں سندھ کی مشہور لوک داستان " سورٹھ رائے ڈیاچ " گائی جاتی ہے۔

سندھ میں سورٹھ رائے ڈیاچ داستان بارھویں صدی عیسوی میں ابھری۔ بنیادی طور پر اس داستان کا تعلق کاٹھیاواڑ سے ہے جو سندھ میں پہنچتے پہنچتے یہاں کے لوگوں اور مٹی کے مزاج میں

رچ کر ایک نیا روپ اختیار کر گئی۔ سندھ کے عظیم محقق اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پرستار ڈاکٹر گربخشانی نے سندھی لوک داستان "سورٹھ رائے ڈیاچ" کا ماخذ کاٹھیاواڑ کی لوک داستان "رائے دیاس" اور گجرات کی نیم تاریخی داستان "رانک دیوی" بتاتے ہیں۔ شاہ صاحب کے سُر سورٹھ کو سمجھنے کے لئے سندھی لوک داستان "سورٹھ رائے ڈیاچ" کا جاننا ضروری ہے۔ لیکن سندھی داستان سے پہلے ہم کاٹھیاواڑ اور گجرات کی داستانوں کا اختصار دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن سے سندھی لوک داستان ابھری۔

کاٹھیاواڑ کی داستان "رائے دیاس"

سندھ کے سمہ خاندان کے ایک حاکم رائے چوڑہ سمہ نے ۸۷۵ء میں کاٹھیاواڑ میں حکومت قائم کی اور "ونستھلی" کے مقام کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ رائے چوڑا سمہ کی اولاد خود کو چوڑا سمہ کہلانے لگی۔ رائے چوڑا کے خاندان میں گرھرپو نام کا ایک زبردست حاکم پیدا ہوا جس نے جوناگڑھ کا قلعہ تعمیر کروایا جسے اب اپرکوٹ کہا جاتا ہے۔ گرھرپو کے بعد اس کا بیٹا رائے کواٹ تخت نشین ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا رائے دیاس سن ۱۰۰۳ء میں کاٹھیاواڑ کا حاکم ہوا۔

رائے دیاس کے زمانے میں گجرات پر دلبھ سین نام کا راجا حکومت کرتا تھا جس کا تعلق راجپوتوں کی سولنکی قبیلے سے تھا۔ راجا درلبھ سین سولنکی کا پایۂ تخت انہلواڑہ پاٹن تھا اور اسی نسبت سے اسے انہلرائے بھی کہا جاتا تھا۔

کاٹھیاواڑ کے راجہ رائے گرھرپو سمہ کے زمانے سے ہی گجرات اور کاٹھیاواڑ کے راجاؤں کے آپس میں اختلافات تھے۔ کاٹھیاواڑ میں گرنار کے علاقے میں ہندوؤں کے مقدس مقامات تھے اور جب بھی گجرات کے شاہی خاندان کے لوگ ان مقامات کی زیارت کو آتے تو کاٹھیاواڑ کے راجاؤں کے کارندے ان سے اچھا برتاؤ نہ کرتے۔ ایک بار گجرات کے راجا درلبھ سین کی بیوی درلبھ دیوی اور اس کی بیٹی چندرووتا اپنے وزیر اور کارندوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر کرتیں جب گرنار پہنچیں تو رائے دیاس نے ان کا راستہ روک لیا۔ وزیر نے وجہ پوچھی تو رائے دیاس نے کہا کہ ہم کاٹھیاواڑ کے حاکم ہیں۔ گرنار ہماری سلطنت میں ہے۔ تم

لوگ محصول دیئے بغیر گرنار کی زیارت کو نہیں جا سکتے۔ وزیر نے عرض کی کہ حضور! ہم محصول دینے کے لیے تیار ہیں۔ جو بھی زر و مال آپ کو چاہیئے آپ ہم سے لے لیں اور ہمیں زیارت کی اجازت دیں۔ رائے دیاس نے کہا کہ ہمیں زر و مال کی ضرورت نہیں۔ ہمیں گجرات کے راجا انہلرائے کی بیٹی چاہیئے۔ ہم اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ رائے دیاس کی بات سن کر وزیر بیحد پریشان ہوا۔ اس نے رانی سے مشورہ کرنے کی اجازت چاہی اور رانی سے مشورہ کرنے کے بعد دست بستہ ہو کر رائے دیاس سے کہا کہ حضور! اگر آپ جیسا راجا ہماری شہزادی سے شادی کرے تو یہ ہماری عزت افزائی ہوگی۔ لیکن حضور! راجاؤں اور راجکماریوں کی شادیاں اس طرح نہیں ہوتیں۔ یہ شادیاں تو بڑے دھوم دھام سے ہوتی ہیں جن میں بڑے بڑے راجے، مہاراجے شرکت کرتے ہیں۔ آپ ہمیں اجازت دیں کہ اس سال ہم زیارت کر کے واپس چلے جائیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگلے سال ہم شہزادی کو دلہن بنا کر لائیں گے اور اس کی آپ سے شادی کرینگے۔ ہم سولنکی راجپوت ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ راجپوت اپنے وعدے سے نہیں پھرتے۔

رائے دیاس نے وزیر کی بات مان لی اور انہیں زیارت کرنے کی اجازت دے دی۔ رانی نے جلدی سے زیارت کی رسومات ادا کیں اور واپس چلی گئی۔ گجرات پہنچتے ہی اس نے انہلرائے کو ساری بات بتائی۔ انہلرائے کو سخت غصہ آیا اور اس نے رائے دیاس سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کا منصوبہ بنایا۔

سال گزر گیا اور زیارت کے دن قریب آنے لگے تو رائے دیاس نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں اسے یقین تھا کہ سولنکی راجپوت اپنے وعدے پر قائم رہیں گے اور زیارت کے دنوں میں بارات لے کر ضرور آئیں گے۔ ایک دن رائے دیاس کو قاصد نے آ کر اطلاع دی کہ گجرات سے بارات آ رہی ہے۔ محل کے دروازے کھول دیئے گئے اور باراتیوں کی ڈولیاں محل میں داخل ہوتی گئیں۔ جب سب ڈولیاں محل میں داخل ہو گئیں تو وزیر نے اعلان کیا کہ باراتیو! اب ڈولیوں سے باہر آؤ۔ وزیر کا اعلان سنتے ہی ہر ڈولی سے چار چار فوجی جوان باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور بھالے تھے اور انہوں نے رائے دیاس کے آدمیوں پر حملہ بول دیا۔ اس اچانک حملے سے رائے دیاس کے آدمی بوکھلا گئے اور رائے دیاس نے محل کے خفیہ راستے

سے بھاگ کر گرنار کے قلعے میں پناہ لی۔ انہلرائے کی فوج کا ونتھلی پر قبضہ ہوگیا۔ وزیر نے انہلرائے کو فتح کی اطلاع دی اور انہلرائے فوج لے کر آیا اور گرنار کا محاصرہ کر لیا۔ گرنار کا قلعہ اونچائی پر تھا اور بہت مضبوط تھا۔ انہلرائے بڑے عرصے تک قلعے کا محاصرہ کئے رہا لیکن قلعہ فتح نہ کر سکا۔

ایک دن وہ اپنے خیمے میں مایوس بیٹھا ہوا تھا کہ خیمے کے باہر ایک بھاٹ نے آکر صدا دی انہلرائے نے اسے خیمے میں بلوایا۔ بھاٹ نے راجا کے قدم چھوئے اور عرض کی کہ میرا نام بیجل ہے۔ میں ذات کا چارن ہوں میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں رائے دیاس کا سر کاٹ کر لے آؤں گا۔ راجا نے کہا کہ اگر تم رائے دیاس کا سر کاٹ کر لے آؤ تو ہم تمہیں دولت سے مالا مال کر دیں گے۔ بیجل نے ایک بار پھر راجا کے قدم چھوئے اور راجازت لے کر گرنار کو روانہ ہوگیا۔

رائے دیاس کی رانی کا نام سورٹھ تھا۔ سورٹھ رانی نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک بھاٹ محل میں آیا ہے اور رائے دیاس سے اس کا سر مانگ رہا ہے۔ رائے دیاس اپنا سر کاٹ کر بھاٹ کو دینے کے لئے تیار ہوگیا ہے۔ سورٹھ رانی اپنے خواب سے بے حد خوفزدہ ہوئی اور اعلان کروایا کہ کسی اجنبی کو قلعے میں آنے نہ دیا جائے۔

بیجل قلعے میں داخل ہوا تو پہریداروں نے اسے معمولی بھاٹ سمجھ کر جانے سے نہ روکا بیجل محل کے پاس آیا اور رائے دیاس کی سخاوت کے قصیدے گانے لگا۔ رائے دیاس نے اس کی آواز سنی تو محل کے جھروکے سے جھانک کر پوچھا کہ تمہیں کیا انعام چاہیئے۔ بیجل نے کہا کہ حضور آپ مجھے اپنے پاس بلالیں تو میں عرض کروں۔ رائے دیاس نے اسے محل میں بلوایا اور پوچھا کہ اب بتاؤ کہ تمہیں کیا انعام چاہیئے۔ بیجل نے کہا کہ حضور میں کوئی معمولی بھاٹ نہیں جو انعام سے خوش ہو جاؤں۔ مجھے ایسا انعام دیجئے جو آج تک نہ تو کسی نے دیا ہو اور نہ ہی کسی نے لیا ہو۔ رائے دیاس نے پوچھا کہ ایسا کون سا انعام ہے جو میں تمہیں دوں۔ بیجل نے کہا کہ ایسا انعام آپ کا سر ہے۔ آپ اپنا سر کاٹ کر مجھے انعام میں دیں تاکہ رہتی دنیا تک آپ کا نام ہو۔ بیجل کی بات سن کر دیاس نے کہا کہ بس اتنی سی بات کے لئے تم پریشان تھے۔ میرا سر حاضر ہے۔ ابھی کاٹ لو۔

سورٹھ کو جب بیجل کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ بھاگتی ہوئی بیجل کے پاس آئی۔ اس کی منت سماجت کی، انعام و اکرام کا لالچ دیا لیکن بیجل نہ مانا۔ دیاس کی بہن کو پتہ چلا تو وہ دیاس کے پاس

آئی اور دیاس سے کہا کہ آپ نے سر دینے کا وعدہ کیا ہے اور راجپوت اپنے وعدے سے نہیں پھرتے۔ دیاس کی ماں نے بھی اس سے یہی کہا کہ وعدہ کیا ہے تو اسے نبھاؤ۔ اب سورٹھ نے بھی شوہر سے کہا کہ آپ اپنا وعدہ نبھائیں۔ آپ اکیلے نہیں ہوں گے میں بھی آپ کے ساتھ مروں گی۔

دیاس نے اپنا سر سجایا اور سر کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ کر بیجل کو دیا۔ بیجل نے جب دیاس کو اپنے ہاتھوں سے اپنا سر کاٹتے دیکھا تو وہ بہت پشیمان ہوا کہ اس نے دیاس جیسے سخی داتا کا سر مانگ کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اس نے سر لینے سے انکار کر دیا۔ رائے دیاس کی ماں نے کہا کہ جب تک تم دیاس سے اس کا سر نہیں لوگے اس کا دھڑ اسی طرح سر ہتھیلی پر رکھ کر کھڑا رہے گا اور اس کی جان نہیں نکلے گی۔ بیجل نے آگے بڑھ کر دیاس کا سر لے لیا اور دیاس کا دھڑ زمین پر گرتے ہی بے جان ہو گیا۔

دیاس کے مرنے کے بعد سورٹھ نے چتا تیار کروائی اور اس میں جلنے کو آگے بڑھی تو دور سے اسے بیجل کی آواز سنائی دی۔ بیجل کے ہاتھ میں دیاس کا سر تھا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ سورٹھ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ آپ جب تک مجھ سے دیاس کا سر واپس نہیں لیں گی۔ میری یہ آگ نہیں بجھے گی۔ سورٹھ نے بیجل سے دیاس کا سر لے لیا اور دعا کی کہ اے خدا! اسے سکون عطا کر اور پھر دیاس کے سر کے ساتھ آگ میں کود گئی۔

گجراتی داستان "رانک دیوی"

کسی زمانے میں تھر کے علاقے پاٹسر پہ رانا روڑ پار سنگ حکومت کرتا تھا۔ رانا روڑ پار کو اللہ نے سب نعمتوں سے نوازا تھا لیکن وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اس نے اولاد کے لئے دعائیں کی، منتیں مانیں۔ آخر خدا نے اس کی دعا سن لی اور اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اسی وقت جوتشی کو بلایا گیا کہ وہ راجکماری کی قسمت کا حال بتائے۔ جوتشی نے ستاروں کا حال معلوم کر کے بتایا کہ یہ لڑکی جوان ہو کر جس سے بھی شادی کرے گی اس سے اس کا تخت وتاج چھن جائے گا۔ رانی جوتشی کی بات سن کر سخت پریشان ہوئی۔ اس نے سوچا کہ ایسی منحوس لڑکی سے تو بے اولاد ہونا ہی بہتر ہے۔ اس نے لڑکی کو صندوق میں ڈالنے اور جنگل میں پھینک آنے کا حکم دیا تاکہ جنگلی جانور اسے کھا جائیں۔

کچھ کے علاقے میں ایک کمہار رہتا تھا اس کا نام ھرمتو تھا۔ اتفاق سے ھرمتو کا جنگل سے گزر ہوا تو اس کی نظر صندوق پر پڑی۔ وہ سمجھا کہ صندوق میں کوئی خزانہ ہے۔ اس نے صندوق کھول کر دیکھا تو صندوق میں ایک چاند سی خوبصورت بچی سوئی ہوئی تھی۔ ھرمتو کمہار خود بے اولاد تھا اس لیے اس نے بچی کو گود لیا اور اس کا نام رانک دیوی رکھا۔

اس زمانے میں کچھ کا راجا لاکھو پھلانی تھا۔ رانک دیوی جب جوان ہوئی تو دور دور تک اس کے حسن کی دھوم پھیل گئی۔ لاکھو پھلانی اسے دیکھے بغیر اس پر عاشق ہو گیا اور ھرمتے کمہار سے رانک دیوی کا رشتہ مانگا۔ ھرمتیہ رانک دیوی کا رشتہ لاکھو پھلانی سے کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ کچھ کو چھوڑ کر جونا گڑھ بھاگ آیا اور مجھوڑی کے مقام پر رہنے لگا۔

اس زمانے میں گجرات کا حاکم راجا سدھراج تھا اور اس کا پایۂ تخت انہلواڑ تھا۔ ایک بار اس کے درباری بھاٹ گھومتے گھامتے مجھوڑی آئے تو رانک دیوی کے حسن کو دیکھ کے حیران رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کمہار کی بیٹی اس قدر حسین بھی ہو سکتی ہے انہیں یقین ہو گیا کہ رانک

دیوی کسی راجا کی بیٹی ہے۔

بھاٹ انہلواڑہ میں واپس آئے تو انہوں نے راجا سدھ راج سے مانک دیوی کے حسن کی تعریفیں کیں اور کہا کہ حضور اسے تو آپ کی رانی ہونا چاہیئے۔ سدھ راج نے کہا کہ ہم راجا ہیں ہم کمہار کی بیٹی سے کس طرح شادی کر سکتے ہیں۔ بھاٹوں نے کہا کہ حضور، وہ کمہار کی بیٹی نہیں وہ تو کسی راجا کی بیٹی ہے اور کمہار کے گھر میں پلی بڑھی ہے۔ ایسی حسین راجکماری سے تو آپ جیسا راجا ہی شادی کر سکتا ہے۔ سدھ راج نے کہا کہ ایسی بات ہے تو آج ہی ہماری شادی کا پیغام لے کر جاؤ اور شادی کی تاریخ مقرر کر آؤ۔

بھاٹ اسی وقت مجھوڑی روانہ ہوتے انہوں نے رمتو کمہار سے رانک دیوی کے رشتے کی بات چھیڑی۔ ھرمتیہ راضی ہوگیا اور دو ماہ کے بعد شادی کی تاریخ مقرر ہوتی۔

اس زمانے میں جونا گڑھ پر رائے کھنگار چوڑا سمہ حکومت کرتا تھا۔ اس کی بہن سدھراج کے بھائی سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس کے ہاں جب دو بیٹے پیدا ہوئے تو میاں بیوی میں ان بن ہوگئی اور وہ اپنے دونوں بیٹوں بیجل اور ڈیبجل کے ساتھ اپنے بھائی کے پاس آگئی۔ ڈیبجل اور بیجل جونا گڑھ ہی میں اپنے ماموں کے محل میں پلے بڑھے۔

ایک دن بیجل اور ڈیبجل شکار کھیلنے مجھوڑی پہنچ گئے وہاں دیکھا کہ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے گاؤں والوں سے پوچھا کہ کس کی شادی ہو رہی ہے۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ ھرمتیہ کمہار کی بیٹی رانک دیوی کی شادی گجرات کے راجا سدھ راج سے ہو رہی ہے۔ وہ دونوں اسی وقت جونا گڑھ لوٹ آتے اور اپنے ماموں سے کہا کہ رانک دیوی بہت حسین لڑکی ہے اور گجرات کا راجا اس سے شادی کر رہا ہے۔ ایسی حسین لڑکی کی شادی تو آپ جیسے راجا سے ہونی چاہیئے۔ راجا نے کہا کہ ایسی بات ہے تو جاؤ اور ھرمتیہ کمہار سے ہمارے لئے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگو۔ بیجل اور ڈیبجل دونوں مجھوڑی آتے اور ھرمتیہ سے رائے کھنگار کے رشتے کی بات چھیڑی۔ ھرمتیہ نے کہا کہ یہ میری خوش قسمتی ہوتی اگر میری بیٹی کا رشتہ رائے کھنگار کے ساتھ ہو جاتا۔ لیکن اب یہ ناممکن ہے اس لیے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی سدھراج سے طے کر چکا ہوں اب اگر میں اپنی بات سے پھر گیا تو سدھراج مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور ساری دنیا میں میری

بدنامی بھی ہوگی لیکن بیجل اور ڈیبجل نے اس کی بات نہ سنی اور رانک دیوی کو زبردستی اٹھاکر جوناگڑھ لے آئے اور رائے کھنگار نے اس سے شادی کرلی۔

سدھ راج کو جب معلوم ہوا کہ اس کی منگیتر کو بیجل اور ڈیبجل زبردستی اٹھاکر لے گئے ہیں اور رائے کھنگار نے اس سے شادی کرلی ہے تو اس نے کاٹھیاواڑ پر حملہ کردیا۔ وہ بارہ سال تک اپرکوٹ کا محاصرہ کئے بیٹھا رہا لیکن قلعہ فتح نہ کرسکا۔

اس دوران میں رائے کھنگار کو شک ہوا کہ اس کا بھانجا ڈیبجل اس کی بیوی رانک دیوی پر بُری نظر رکھے ہوئے ہے۔ ڈیبجل کو جب معلوم ہوا کہ اس کا ماموں اس پر شک کرنے لگا ہے تو وہ اپنے بھائی بیجل کو ساتھ لے کر بھاگ گیا اور سدھ راج سے آملا۔ اس نے سدھراج سے کہا کہ ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا کہ آپ ہمارے چچا ہیں۔ اب ہمیں معلوم ہوا تو ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوگئے ہیں۔ اب ہم آپ کی مدد کریں گے اور اپرکوٹ فتح ہوگا۔

بیجل اور ڈیبجل جب قلعے سے باہر نکل رہے تھے تو انہوں نے پہریداروں سے کہا تھا کہ راجا کے مہمان آنے والے ہیں ہم ان کو لینے جا رہے ہیں تم لوگ قلعے کے دروازے کھلے رکھنا۔ اب انہوں نے ڈولیاں تیار کروائیں۔ ہر ایک ڈولی میں فوجی جوان بٹھائے اور قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ پہریداروں نے بیجل اور ڈیبجل کو دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ ڈولیاں راجا کے مہمانوں کی ہیں انہوں نے ڈولیوں کو قلعے میں جانے دیا اس طرح سدھراج کی فوج قلعے میں داخل ہوگئی اور قلعہ فتح ہوگیا۔ رائے کھنگار مارا گیا اور رانک دیوی کو سدھراج کے سامنے پیش کیا گیا۔ سدھراج نے اس سے شادی کرنی چاہی لیکن رانی نے انکار کردیا اور چتا میں جل کر جان دے دی۔

بیجل اور ڈیبجل نے سدھراج کو فتح کی خوشی کی مبارکباد دی تو سدھراج نے کہا کہ تم جب اپنے ماموں سے وفادار نہ رہے تو مجھ سے کیسے وفادار رہوگے۔ اس نے تلوار نکالی اور دونوں کو قتل کردیا۔

یہ دونوں داستانیں جب سندھ میں پہنچیں تو آپس میں گڈمڈ ہو کر اور سندھی مزاج میں ڈھل کر ایک نئی داستان کے روپ میں ابھریں۔

کاٹھیاواڑ کا راجا رائے دیاس اور گجرات کا راجا انہلرائے سندھی داستان میں رائے ڈیاچ اور انیرائے بن گئے۔

کاٹھیاواڑ کی داستان میں سورٹھ اور بیجل کے کردار نصف داستان کے بعد سامنے آتے ہیں۔ سورٹھ کا کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ خواب دیکھتی ہے کہ محل میں ایک بھاٹ آیا ہے اور رائے دیاس کا سر مانگ رہا ہے۔ اور بیجل کا کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ گجرات کے راجا انہلرائے کے خیمے کے باہر صدا لگاتا ہے اور رائے دیاس کا سر کاٹ کر لے آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ جبکہ سندھی داستان میں سورٹھ اور بیجل کے کردار پوری داستان پر چھائے ہوئے ہیں اور دونوں کرداروں کا منطقی ارتقا ہوتا ہے۔

رانک دیوی داستان میں بیجل اور ڈیجل گجرات کے راجا رائے کھنگار کے بھانجے ہیں۔ اور گجرات کے راجا سدھراج کے بھتیجے ہیں۔ سندھی داستان میں ڈیجل کا کردار حذف ہو گیا ہے۔ بیجل رائے کھنگار کا بھانجا ہے لیکن انیرائے سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔

رانک دیوی داستان میں جب رانک دیوی پیدا ہوتی ہے تو جوتشی اس کے مستقبل کے متعلق پیشگوئی کرتا ہے اور اس کی ماں اسے صندوق میں ڈلوا کر دریا میں پھینکوا دیتی ہے۔ سندھی داستان میں یہ واقعہ بیجل سے منسوب ہے۔ رائے ڈیاچ کی بہن بے اولاد تھی۔ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے اور جوتشی اس کے متعلق پیشگوئی کرتا ہے کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر اپنے ماموں رائے ڈیاچ کو قتل کرے گا اس کی ماں اسے صندوق میں ڈلوا کر دریا میں پھینکوا دیتی ہے۔

رانک دیوی کی طرح سندھی کہانی میں بھی سورٹھ کو صندوق میں ڈال کر پھینکوایا جاتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے باپ کی ساٹھ لڑکیاں تھیں اور جب سورٹھ پیدا ہوتی ہے تو وہ اسے دریا میں پھینکوا دیتا ہے۔

سندھی داستان میں بھی سورٹھ انیرائے کی منگیتر ہوتی ہے جس سے رائے کھنگار شادی

کر لیتا ہے اور رانیرائے انتقام لینے کے لئے گرنار پر حملہ کرتا ہے۔ لیکن اصل میں سورٹھ انیرائے کی بیٹی ہوتی ہے لیکن دونوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ دونوں کا باپ بیٹی کا رشتہ ہے۔

کاٹھیاواڑ کی داستان میں بیجل ایک بھاٹ ہے۔ اور وہ بھاٹوں کی طرح رائے دیاس سے سر کی خیرات مانگتا ہے جب کہ سندھی داستان میں وہ موسیقار ہے اور اپنے سنگیت سے وہ رائے ڈیاچ کو مست کرکے سر کا دان مانگتا ہے۔ سندھی داستان میں موسیقی، ساز اور سُروں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

کاٹھیاواڑ کی داستان میں بیجل ایک لالچی بھاٹ ہے جو انعام کے لالچ میں رائے دیاس کا سر لانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس سندھی داستان کا بیجل حالات کے جبر کا شکار ہو کر رائے ڈیاچ کا سر لانے کی حامی بھر لیتا ہے۔

سندھی داستان "سورٹھ رائے ڈیاچ"

کاٹھیاواڑ پر رائے ڈیاچ نام کا ایک راجپوت راجا حکومت کرتا تھا۔ اسے رائے کھنگار بھی کہتے تھے۔ رائے ڈیاچ کی ایک بہن تھی جس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اسے اولاد کی بڑی تمنا تھی۔ اس نے فقیروں سے دعائیں کروائیں۔ نجومیوں سے قسمت کا حال پوچھا لیکن اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔

ایک دن گرنار میں ایک نجومی آیا۔ رائے ڈیاچ کی بہن کو پتہ چلا تو اس نے نجومی کو محل میں بلوایا اور اس سے قسمت کا حال پوچھا۔ نجومی نے حساب لگا کر بتایا کہ تم ایک بیٹے کی ماں بنوگی لیکن تمہارا بیٹا بڑا ہو کر اپنے ماموں رائے ڈیاچ کو قتل کرے گا۔

کچھ عرصے کے بعد اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اسے نجومی کی بات یاد آگئی۔ اس نے ایک

صندوق منوایا، بچے کو صندوق میں ڈالا اور ساتھ ہی ہیرے جواہر رکھ کر صندوق دریا میں پھینکوا دیا
صندوق دریا میں تیرتا اجمیر پہنچا۔ وہاں ایک چرواہے نے دریا سے صندوق نکال کر کھولا تو حیران رہ گیا۔ صندوق میں ایک خوبصورت بچہ میٹھی نیند سو رہا تھا اور ساتھ ہی ہیرے جواہر رکھے تھے۔ چرواہے نے بچے کا نام بیجل رکھا اور بیٹے کی طرح اس کی پرورش کرنے لگا۔
اسی زمانے میں اجمیر پر انیرائے نام کا سولنکی راجپوت حکومت کرتا تھا۔ وہ بڑا ظالم بادشاہ تھا اور اس نے آس پاس کے کمزور راجاؤں کو اپنا مطیع بنا رکھا تھا۔ جب بھی اجمیر میں کوئی پردیسی آتا تو وہ اسے اپنے دربار میں بلا کر پوچھتا کہ بتاؤ اس دنیا میں ہم سے زیادہ طاقتور بادشاہ کوئی اور ہے۔ پردیسی اس کے خوف کے مارے جواب دیتے کہ نہیں حضور۔ ہم نے آپ سے زیادہ طاقتور بادشاہ اور کوئی نہیں دیکھا۔
ایک دن اجمیر میں ایک جوگی آیا تو انیرائے نے یہی سوال اس سے بھی کیا۔ جوگی نے کہا کہ میں نے آپ سے بھی زیادہ طاقتور بادشاہ دیکھا ہے اور وہ کاٹھیاواڑ کا حاکم رائے ڈیاچ ہے۔
جوگی کی بات سن کر انیرائے نے رائے ڈیاچ پر حملہ کر کے اسے اپنا مطیع بنانا چاہا لیکن وزیروں اور مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ رائے ڈیاچ کو مطیع کرنا اتنا آسان نہیں وہ طاقتور بادشاہ ہے۔ اس کا قلعہ ایک ایسے پہاڑ پر ہے کہ جس کی بلندی پانچ کوس ہے۔ قلعے کے چار سو برج ہیں اور ہر برج پر فوجی دستہ متعین ہے۔
انیرائے نے وزیروں کی بات سن کر ڈیاچ پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔
انیرائے کی ساٹھ بیٹیاں تھیں اس کے ہاں جب ایک اور بیٹی پیدا ہوئی تو اس نے اسے صندوق میں ڈالنے کا حکم دیا اور دریا میں پھینکوا دیا۔ صندوق دریا میں تیرتا ہوا گرنار پہنچا گرنار میں رتنا نام کا ایک کمہار رہتا تھا۔ اس نے دریا سے صندوق نکالا اور بچی کو اپنے گھر لے آیا۔ رتنا نے بیٹی کی طرح اس کی پرورش کی اور اس کا نام سورٹھ رکھا۔
بیجل جوان ہوا تو بکریاں چرانے لگا۔ ایک دن وہ بکریاں چرا رہا تھا تو اسے موسیقی سنائی دی۔ اس نے دیکھا کہ ایک درخت پر ہرن کی انتڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں

سے ٹہنیاں ہلتیں، انٹریاں ایک دوسرے سے رگڑ کھاتیں تو اس سے سُر پھوٹتے۔ ان سُروں میں ایسا جادو تھا کہ جنگل کے چرند، پرند اور وحشی جانور وہاں جمع ہو گئے تھے اور خاموشی سے موسیقی سُن رہے تھے۔ بیجل نے ان انتڑیوں کو کاٹ کر ایک ساز بنایا یہ کھماچ ساز تھا اور اسے کینرو اور سرندو بھی کہا جاتا تھا۔ بیجل ساز بجاتا تو جانور اس کے گرد جمع ہو جاتے اور خاموشی سے اس کا ساز سنتے۔

سورٹھ جوان ہوئی تو رتنا کمہار کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ رتنا رہتا تو گرنار میں تھا لیکن وہ انیرائے کا ملازم تھا۔ ایک بار وہ چھٹیاں گزارنے گرنار آیا اور دیر سے واپس لوٹا۔ انیراتے نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو رتنا نے کہا کہ حضور! میری ایک جوان بیٹی ہے۔ مجھے اس کی شادی کی فکر لگی ہے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے میں دیر لگ گئی اور مناسب رشتہ بھی نہ ملا۔ انیرائے نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو ہم تیری بیٹی کو اپنی رانی بنانے کے لیے تیار ہیں۔ رتنا نے ہاں کر دی اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رتنا چونکہ گرنار میں رہتا تھا اور گرنار رائے ڈیاچ کا پایۂ تخت تھا۔ اس لیے انیراتے نے سوچا کہ اگر ہم بارات لے کر گرنار جائیں گے تو ڈیاچ سمجھے گا کہ انیرائے نے اس پر فوج کشی کی ہے اس لیے انیراتے نے رتنا کو اپنی تلوار دی اور کہا کہ ہماری تلوار سے سورٹھ کی شادی کرائی جائے۔ جس وقت بارات گزر رہی تھی اس وقت رائے ڈیاچ اپنے محل کے جھروکے میں بیٹھا ہوا تھا اس نے وزیروں سے پوچھا کہ یہ کس کی بارات ہے۔ وزیروں نے کہا کہ اجمیر کے راجا کی شادی رتنا کمہار کی بیٹی سورٹھ کے ساتھ ہو رہی ہے اور یہ سورٹھ کی بارات ہے۔ ڈیاچ نے کہا کہ رتنا ہماری رعایا ہے۔ اس کی بیٹی انیراتے کی نہیں، ہماری رانی بنے گی۔ اسی وقت انیراتے کی بارات کو واپس کر دیا گیا اور رتنا کو بلا کر ڈیاچ نے سورٹھ سے شادی رچالی۔

انیراتے کو جب پتہ چلا کہ اس کی منگیتر سے ڈیاچ نے شادی کر لی ہے تو اس نے ڈیاچ پر حملہ کر دیا لیکن وہ گرنار کے قلعے کو فتح نہ کر سکا۔

انیراتے نے اجمیر میں واپس آ کر اعلان کروایا کہ جو بھی رائے ڈیاچ کا سر کاٹ کر لائے گا اسے دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا۔ بیجل کی بیوی نے یہ اعلان سنا تو وعدہ کیا کہ میرا

شوہر بیجل رائے ڈیاج کا سر کاٹ کر لے آئے گا۔ بیجل کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ اس کی بیوی نے بادشاہ کے کارندوں سے وعدہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا لیکن اب اسے اپنی بیوی کا وعدہ پورا کرنا تھا ورنہ انیرائے اسے اور اس کی بیوی کو قتل کروا دیتا۔

ایک رات سورٹھ نے خواب میں دیکھا کہ گرنار میں ایک موسیقار آیا ہے اور وہ رائے ڈیاج سے اس کا سر مانگ رہا ہے۔ رائے ڈیاج اسے اپنا سر دینے کے لئے راضی ہو گیا وہ اپنے خواب سے بہت خوفزدہ ہوئی اور حکم دیا کہ کسی اجنبی کو قلعے کے اندر نہ آنے دیا جائے۔

بیجل نے ساز اٹھایا اور اللہ کی آس کر کے گرنار کو چلا۔ پہریداروں نے اسے بھک منگا بھاٹ سمجھ کر قلعے میں جانے کی اجازت دے دی۔ بیجل نے محل کے قریب بیٹھ کر ساز بجایا۔ رائے ڈیاج نے اس کے ساز کی آواز سنی تو اسے بہت پسند آئی اس نے بیجل کو محل میں بلوایا۔ بیجل نے ساز بجایا اور راجا بہت خوش ہوا۔ اسے انعام و اکرام سے نوازا لیکن بیجل نے انعام قبول نہ کیا۔ روز وہ ساز بجاتا اور راجا اس کے ساز کے سروں پر مست ہو کر اسے انعامات دیتا اور بیجل وہ سب واپس کر دیتا۔ ایک دن ڈیاج نے اس سے وعدہ کر لیا کہ جو بھی تم مانگو گے میں تمہیں دوں گا۔ بیجل نے اس سے سر مانگ لیا اور ڈیاج نے سر دینے کا وعدہ کر لیا۔ سورٹھ کو پتہ چلا تو وہ بھاگی بھاگی بیجل کے پاس آئی اور اس کی منتیں کیں لیکن بیجل نہ مانا۔ پھر گرنار شہر کے لوگ اس کے پاس آئے اور اس کی منتیں کیں لیکن بیجل نہ مانا۔ ڈیاج نے اپنی ماں سے مشورہ کیا۔ ماں نے کہا کہ موت تو ایک نہ ایک دن آنی ہے۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ اب اپنا وعدہ پورا کرو۔

ڈیاج نے اپنا سر سجایا۔ بیجل نے ساز بجایا اور ڈیاج نے اپنا سر کاٹ کر بیجل کو دے دیا۔ بیجل ڈیاج کا سر لے کر انیرائے کے پاس آیا۔ انیرائے نے کہا کہ تم ڈیاج جیسے سخی اور بہادر راجا کا سر کاٹ کر لے آئے۔ تم جیسے انسان سے نیکی کی امید نہیں کی جا سکتی اس لئے ہم تمہیں جلاوطن کرتے ہیں۔

بیجل اپنی بیوی کے پاس آیا اور بیوی کو سارا حال بتایا۔ اس کی بیوی بہت پشیمان ہوئی۔ بیجل نے بیوی کو چھوڑا اور ڈیاج کا کٹا ہوا سر ساتھ لے کر گرنار کو چل دیا۔ اس

کی بیوی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی ۔

بیجل جب گرنار پہنچا تو دیکھا کہ سارا شہر ماتم کدہ بنا ہوا تھا ۔ سورٹھ نے چتا تیار کروائی تھی اور قلعے سے اس میں کودنے کے لئے تیار تھی ۔ بیجل نے سورٹھ کو آوازیں دے کر روکنا چاہا لیکن سورٹھ آگ میں کود گئی ۔ بیجل بھی اس کے پیچھے پیچھے آگ میں کود گیا اور بیجل کی بیوی بھی بیجل کے ساتھ ہی آگ میں کود کر جل گئی ۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سُر سورٹھ میں داستان کے خدوخال :

شاہ صاحب نے اس داستان کو تسلسل کے ساتھ منظوم نہیں کیا ۔ وہ کسی بھی لوک داستان کو تسلسل کے ساتھ بیان نہیں کرتے ۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوک داستانیں ان لوگوں کے احساساتی ، ثقافتی اور روحانی آپ بیتیاں ہیں جن کے لیے وہ شاعری کر رہے ہیں اور یہ داستانیں ان کی دلوں میں زندہ ہیں ۔ اس لیے وہ پوری داستان بیان کرنے کے بجائے اس داستان سے چند ڈرامائی واقعات کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کو اپنے شعری احساسات اور روحانی تجربوں کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں ۔ داستان کے کرداروں کو نئے معنی دیتے ہیں اور یہ کردار اپنی داستانی شناخت قائم رکھتے ہوتے بھی کسی اور ہستی ، کسی اور محبوب اور کسی اور آدرش کا استعارہ بن جاتے ہیں ۔

شاہ صاحب کے سُر سورٹھ کا آغاز اس واقعے سے ہوتا ہے کہ جب بیجل اپنا ساز سجا کر اور اللہ کی آس کر کے گرنار کو روانہ ہوتا ہے ۔ قلعے کے پاس بیٹھ کر ساز چھیڑتا ہے تو سُروں کی آنچ سے سارا شہر سلگنے لگتا ہے لوگ اس پر ہیرے موتیوں کی بارش کرتے ہیں

لیکن وہ ہیروں کو ہاتھ نہیں لگاتا

کر کے آس وہ رب کی، چلا وہاں سے آج
خوب سجایا گائک نے، اپنا ساز کھماج
دور سے ڈولی آتی دیکھی، دیکھا راۓ ڈیاچ
دل ہی دل میں دعائیں مانگیں، تو ہی رکھیو لاج!
میرے مولا! آج، راجا ریجھے راگ پر

جونا گڑھ کے شہر میں، آیا موسیقار
آن کے اس گائک نے، ایسے چھیڑے تار
سُلگا سُر کی آنچ سے، سب کا سب گرنار
تڑپ اُٹھے تھے شہر کے باسی، تار کی سن جھنکار
کہیں یہ سُر اور تار، قاتل ہے یہ منگتا

پاس قلعے کے بیٹھ کر، گایا ساری رات
برسے موتی برکھا جیسے، پر نہ بڑھایا ہاتھ
میراثی تھی ذات، جبھی تو مان ملا تھا

راجا بیجل کو محل میں بلواتا ہے اور بیجل اپنا ساز چھیڑتا ہے تو سُروں سے سارا محل مسمار ہونے لگتا ہے۔

محل میں لے کر آیا گائک، ساز وہ پراسرار
ایسے چھیڑے سُر کہ سارا محل ہوا مسمار
سن لیں سب نے صدائیں سُر کی، ھر سُو ھاھا کار
روئے گا گرنار، محل میں ہوگا ماتم

محل میں آیا گائک، لے کر اپنا ساز
سُر میں ہوں گی صدائیں سُر کی، باجیں گے پھر تار
سر بن اب سلطان کے، مانے گا نہ یار
روئے گا گر نار، محل میں ہو گا ماتم

اب راتے ڈیاچ اور بیجل کے کرداروں میں ڈرامائی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں بیجل اجل کی علامت بن جاتا ہے تو کہیں بلندیوں پہ پہنچ کر "انا احمد بلا میم" کا استعارہ بن جاتا ہے۔ قاتل اور مقتول، راجا اور راگی دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور یکتائی کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا۔

بیجل نے پھر چھیڑی، عجب سُروں کی گت
جاگی ڈیاچ کے من میں، سُر سنگیت کی چاہت
بھید بتایا بیجل نے، دیکھ کے اچھی ساعت
"انا احمد بلا میم" ہر سُر کی تھی صورت
اب تو تھی بس وحدت، کچھ ہی جان سکے تھے

چند ہی ایسے لوگ تھے جن کو بات سمجھ میں آئی
وہ ہی بھید یہ جان سکے تھے، جن میں تھی بینائی
الانسان سرّی وَ اَنا سِرُّہٗ، بات تھی یوں فرمائی
اب تو تھی یکتائی، راجا راگی ایک ہوتے

بھید بتایوں رنگ محل میں آتے ہیں کب راگی
نور تجلّی نور کی، آنکھوں نے جب دیکھی
خیمے میں کھنگار کے، پھیلی نور تجلّی

راگی پہ جب دان کی بارش، چاروں اور سے برسی
سب نے بات یہ سمجھی، مان گئے راگی کو

سِسکا ایک ایک سُر، ساز بجا لاہوتی
چھیڑا ساز حضور میں، پارس تھا وہ راگی
دیکھ کے رائے ڈیاچ کو، ظاہر ہوا وہ ذاتی
اور نکال کے کاتی، کاٹ لیا سر ڈیاچ کا

جب سورٹھ مر جاتی ہے۔ رائے کھنگار اس جہان سے لا دجاتا ہے تو علامتوں اور استعاروں کا ایک نیا جہان تخلیق ہو جاتا ہے۔ جس جہان میں نہ راگ ہے، نہ روپ ہے، نہ سُر ہیں، نہ تار ہیں اور بیجل رائے کھنگار کا کٹا ہوا سر واپس لا کر اسے دیتا ہے۔ اب پھر تار جھنجھنا اٹھتے ہیں، اب پھر وہ ہی راگ ہے، وہ ہی روپ ہے اور دھرتی کے اس پار علامتوں اور استعاروں کے اس جہان میں رائے ڈیاچ بیجل سے راضی ہو جاتا ہے۔

سُکھ کی موت ہوئی، لاد چلا کھنگار
جب نہ راگ نہ روپ تھا، نہ ہی سُر نہ تار
لا کر سر تب یار، دیا تھا رائے ڈیاچ کو

سُکھ کی موت ہوئی، لاد چلا کھنگار
وہ ہی روپ تھا راگ وہ ہی، باج اُٹھے تھے تار
دھرتی کے اس پار، راضی تھا تب راجا

مرا چھری

ہمارے کلاسیکی راگوں کے نظام میں سورٹھ کھماچ ٹھاٹھ کا راگ ہے معارف النغمات کے مصنف کے مطابق یہ اوڈھو کا ڈھو راگ ہے، جس کا ورج سُر گندھار، وادی سُر رکھب اور سموادی سُر دھیوت ہے آروھی میں رکھب اور دھیوت نہیں لگتے اور امروھی میں گندھار کے علاوہ سارے سُر لگائے جاتے ہیں۔ مدھم گرہ کا اور رکھب نیاس کا سُر ہے

سورٹھ دیس سے ملتا جلتا راگ ہے لیکن دیس کھماج ٹھاٹھ کا اوڈو سمپورن راگ ہے۔ اس کا وادی سُر رکھب اور سموادی سُر نکھاد ہے۔ آروھی میں گندھار نہیں لگایا جاتا لیکن امروھی میں گندھار لگایا جاتا ہے اور یہی سُر اس کو سورٹھ سے الگ کرتا ہے۔ بعض اسے امروھی میں کومل گندھار لگا کر سورٹھ سے الگ کرتے ہیں۔ معارف النغمات کے مصنف نے سورٹھ اور دیس کے سروں کے بندھن اس طرح دیئے ہیں۔

سورٹھ :

آروھی :	سا ما رے ما پا نی سا
امروھی :	سا نا دھی پا ما رے سا
وادی سُر :	رکھب
سموادی سُر :	دھیوت

دیس :

آروھی :	سا رے ما پا ۔ نا دھی ۔ پا نی سا
امروھی :	سا نا دھی پا ۔ ما گی رے سا
وادی سُر	رکھب
سموادی سُر	نکھاد

سندھ میں سورٹھ کی شکل دیس کی ہے۔ شاہ صاحب کا سورٹھ راگ بھی دیس سے ملتا جلتا ہے اسے اتر انگ کے سروں میں زیادہ گایا جاتا ہے اس لیے اسے تارا ستان کا راگ بھی کہتے ہیں۔

کلام اور ترجمہ

(١)

اللهجي آس ڪَري، هليو هِتائين
چارَڻ ٻَڌا چَنگَ کي، جهُوڙاءِ جهائين
ڏولي راءِ ڏِياچَ جي، ڏوران ڏِنائين
وَينتي واحِدَ دَرِ، تنهن ويرَ ڪَيائين
سَپاجهاسائين! راءُ رِيجهائين راڳ سين

(٢)

پَرِديسيان پَنڌُ ڪَري، هَلي آيو هِتِ
جاجِڪَ اُپوچِتِ، سِرَجون صداڱون هَڻي

(۱)

کر کے آس وہ رب کی، چلا وہاں سے آج
خوب سجایا گائک نے، اپنا ساز کھماج
دور سے ڈولی آتی دیکھی، دیکھا رائے ڈیاچ
دل ہی دل میں دعائیں مانگیں، تو ہی رکھیو لاج!
میرے مولا! آج، راجا ریجھے راگ پر

(۲)

دُور دیس سے چل کر گائک، آیا آج یہاں
منگتا جہاں تہاں، سُر کی مانگے بھیک

(٣)

پرديسيان پَنڌُ ڪَري، هَلي آيو هِتيَ
مال نه مَڱي مَڱٽو، جاجِڪ گهُري جِتيَ
وَڏِ وَهِلو ٿِيَ، ساعَتَ صَبُرُ نه سهان

(٤)

پرديسيان پَنڌُ ڪَري، هَلي آيو هوُن
اُونچو توُن عَرِش تي، آن پورو مَٿي پوُن
ڪِيئن تُسنديِن توُن، هي سِرَسُوالي مَڱٽو

(۳)

دُور دیس سے چل کر گاہک، آج یہاں پر آیا
خواہش مال و زر کی نہیں ہے، مانگے ہے سر منگتا
"صبر نہیں پل بھر کا، کاٹ لے سر اب منگتے!"

(۴)

دور دیس سے چل کر، تیرے در پر آیا
اُونچا ہے تو عرش پہ، میں دھرتی کا ذرّہ
مانگ رہا سر منگتا، کیسے تو سر دے گا

(٥)

"پرديسيان پنڌ ڪري، آيُس آڳاهين ماءِ،
جي وهائي ويرم ٿئي، ته مون هيرئي هلاءِ
سونهارا سورن ور ! اڳالهم هنئين سين لاءِ
سو مڱڻهار ملهاءِ، جو وچان ويرين آئيو"

(٦)

"پرديسيان پنڌ ڪري، سٽي آيس شاهُ
مڱڻ ڪهڙي ءَ مت سين؟ نسورو ناداهُ
سو ڪو ڏيارئين ڏاهُ، جو طمع کي ترڪ ڪري"

(۵)

"دُور دیس سے چل کر، پہنچا ہوں میں آج
صبح تلک گر دیر لگے، کر اب پورا کاج
میری بات لگا لے دل سے، سورٹھ کے سرتاج!
اس کو خوش کر آج، جو دشمن دیس سے آیا"

(٦)

دُور دیس سے آیا ہوں، سُن کر تیری شان
مانگوں میں کس منہ سے، ٹھہرا جو نادان
ایسا دے اب دان، کہ ترک ہو طمع تمام

(٧)

”سَرِدي ۽ سالم نه رَهان، گَرميءَ تِيان گُداز
امن ڏيج امان تون، سائِلَ اِهَٽي ساز
رباڻيءَ کي راز، خالص ڏيجِ خليل جو“

(٨)

”سردي ۽ سالم نه رهان، کوسيءَ سَهان ڪانَ
امن ڏيجِ امان تون، دور ڪري بيا دانَ،
پانڌَپ اِڪائي پان، وِجهج پڪ پيينارتيءَ“

(۷)

"سرما میں تو رہوں نہ سالم، گرمی کرے گداز
مجھے اماں میں اپنی رکھیو، سائل! چھیڑ کے ساز
تجھ سے کہوں وہ راز، خالص ہے جو خلیل کا"

(۸)

"سرما میں تو رہوں نہ سالم، گرمی سہی نہ جائے
مجھے اپنی امان میں رکھیو، دوجے دان بھلا کے
اپنا رنگ چڑھا دے، رنگ دے اپنے رنگ میں"

(۹)

"تو دَرِ آيُس، راڄيا! جا ڄڪُ وٽي ڄڻيَ
ڪَنان" نارَ حاميه"، هاڻِ بَچائڄِ هيٽَ
والي ڏيار سيئي وِيَ، جِت آهي "جنات عَدنِ"

(۱۰)

تو دَرِ آيُس، راڄيا! هُرو وٽي حالُ
اوناٿيج عَليل جو، سَبا جها! سُوالُ
اَگُنَ مَتي آنهنجي، ڪهي ڪي قوّالَ
پَلا! ڪري پالُ، اَمَن ڏِيو اُن کي

(۹)

تیرے در پر آیا ہوں، من میں ہے اک آس
جلتی آگ سے مجھے بچا لے، کر نہ مجھے نراس
آئے چمن وہ راس ، جہاں پہ خلدِ عدن ہے

(۱۰)

تیرے در پہ آیا ہوں ، دیکھ تو میرا حال
سن لے عرضِ علیل ، سن لے یار! سوال
تیرے آنگن بول رہا ہے، اے راجا! قوّال
مہر کا دے تو مال ، امن کی دولت دے دے

(١١)

”تو دَرِ آيُس، راجيا! پيادَر ڪري دُورِ
سائِلُ توسَين هٽي، هَرِدَم آن حضُورِ
پيو نه مَگّي مُورِ، امن ڏيو اُنَ کي“

(١٢)

تو دَرِ آيُس راجيا! پيادَر ڏيئي پَنّ،
کَهان جو ڪُماچ سين، سُوسُٽ سپاجهي ڪَنّ
جا مَگّ منهنجي مَنّ، سا توکي معلوم سپڪا

(۱۱)

"چھوڑ کے دوجے دروازے، تیرے در پر آیا
ہر پل سائل صدا لگائے، سن لے یار! صدا
مانگے مھر یہ منگتا، اور نہ مانگے دان"

(۱۲)

"چھوڑ کے دوجے دروازے، آیا تیرے دوار
سن لے صدا سُروں کی، دل سے اے کرتار!
کہتے ہیں جو تار، تجھے تو ہے معلوم"

(١٣١)

”ٻِيا دَرَ ڏيسُئي ٻَنَ کي، آيُسِ تنهنجي دَرِ
سونهارا سورتِ وَرَ! ڪا مُنهنجي ڪَرِّ
پَلا! پيري پَرِّ، پالهو پانڌُ پينارَ جو“

(۱۳)

چھوڑ کے دوجے دروازے، چوما تیرا در
میرا بھی کچھ کر لے اب تو، سوہنے سورٹھ بر!
خالی دامن بھر، پھیلائے جو بھکاری

وائي

ڏنوراءِ ڏياڄ، هِيءُ سِرُ صاحبَ تان صَدِقو
ڇڏيي هِليو هِتَ هين، راڻيون پنهجا راڄَ
اَگھيو دَرِ الله جي، ڪوڙين پُنَس ڪاڄَ
مَگي وَرِ تو مگٽي، کهي ساڻ ڪما ڄ
اَديُون، عبدالطيف چئي، تِيس ڪم سَڪاڄَ

وائی

راجا رائے ڈیاچ، سُر پر سَر کو وار دیا ہے
کیا کیا سندر رانی چھوڑی، چھوڑ دیا سب راج
سَر کا دان دیا داتا نے، کیسا اُتم کاج
مانگا سر منگتے نے، چھیڑ کے، ساز کھماچ
سکھیو! شاہ لطیف کہے کہ، راجا پورن آج

داستان ٻيو:

(١)

جاجڪُ جھونا ڳُڙهَه مِ، ڪوعطائي آيو
تنهن ڪامِل ڪيڏي ڪينرو، ويھي وڄايو
شَھَرسَڄوئي سُرَسين، تَنڏُنِ تپايو
ڏايُون ڏِرمانڊِيون ٿيُون، بايُنِ پا ڏايو
چارڻ تي چايو، ته ماري آهي مڱڻو

(٢)

ساري رات صاحب کي، ڳِڙهَه پِر ڳايائين
اُنس مالڪ مِنهن جِئَن، هَٿ نه ڇِتايئين
تي لائِق لَڌائين، جِئَن هو ميراثي مڱڻو

دوسری داستان:

(۱)

جھوناگڑھ کے شہر میں، آیا موسیقار
آن کے اُس گائک نے، ایسے چھیڑے تار
سُر کی آنچ سے سلگ اٹھا، سب کا سب گرنار
تڑپ اٹھے پھر شہر کے باسی، تار کی سن جھنکار
کہیں یوں سُر اور تار، کہ قاتل ہے یہ منگتا

(۲)

پاس قلعے کے بیٹھ کر، گایا ساری رات
موتی برسے جیسے برکھا، پر نہ بڑھایا ہاتھ
میراثی تھی ذات، جبھی تو مان ملا تھا

(٣)

ٻِرتيءِ تَندُ نياز سين، ٻيجل ٻُرائي
راجا رَتولن ۾، وَرائي وائي
کوتا يائين کوٽ ۾، ٻارِٿُ ٻاجهائي
راجا راڳائي، هَرِ دوئي هيڪُ ٿيا

(٤)

ٻِرتي تَندُ نياز سين، ٻرائي ٻيجَلَ
راجا رَتولَنِ ۾، اونائي اَمُلَ!
راز کيائين راءِ سين، کنهن موچاريءَ مَهَلَ
"اَنَا اَحمَدُ بِلا ميم" سين هَنئي سائِلَ
کَنهن کَنهن ٻيئي کَلَّ، ته هر دوئي هيڪ ٿيا

(۳)

سوچ کے پھر سائل نے، عجز سے چھیڑے تار
راجا رنگ محل میں، سُروں سے تھا سرشار
پھر سے رنگ محل میں، بلوایا گُن کار
راجا موسیقار، دونوں مل کر ایک ہوئے

(۴)

بیجل نے پھر چھیڑی، عجب سُروں کی گت
جاگی ڈیاچ کے من میں، سُر سنگیت کی چاہت
بھید بتایا بیجل نے، دیکھ کے اچھی ساعت
"احمد ہوں میں میم بنا"[1] ہر سُر کی تھی صورت
اب تو تھی بس وحدت، کچھ ہی جان سکے تھے

[1] انا احمد بلا میم

(٥)

ڪِنين ڪِنين ماڙهين، پيئي ڪَل ڪائي
رَسياجي رَمزَ جي، تِن پارسي پائي
اَلاِنسَانُ سِرّيُ وَاَنَا سِرُّهٗ، ورتي اِي وائي
راجا راڳائي، هَرِ دوئي هيڪُ ٿيا

(٦)

راجا رَنگِ مَحَلَ ۾، جاجِڪُ سرزمينَ
جاهَنيائِين هَٿَنِ سين، ساسُئي بالابِينَ
جِت اَچَنِ نه اُرِدا بيگيون، اُتِ ڪوئايو امينَ
تازي ڏيوس تَڪِڙا، جَو هَرَ پائِي زين
بيو مگي ڪينَ، ڌاران سِرَ سَيّدُ چئي

(۵)

چند ہی ایسے لوگ تھے جن کو، بات سمجھ میں آئی
وہ ہی بھید یہ جان سکے تھے، جن میں تھی بینائی
اَلْاِنْسان سِرّی وَاَنا سِرُّہ، بات نبیؐ یوں فرمائی
اب تو ہے یکتائی، راجا راگی ایک ہوئے

(٦)

راجا رنگ محل کا باسی، خاک نشیں ہے راگی
تڑپ اٹھا ہے محل میں راجا، چھیڑی تان کچھ ایسی
جہاں تلک نہ پہنچا کوئی، پہنچ وہاں ہے اس کی
"اعلیٰ نسل کے گھوڑے دو، اور بھر دو جھولی خالی"
سَر کا ہے یہ سوالی، اور نہ مانگے منگتا

(٧)

راجا جو راضي ٿيو، تنهن ڏنا وڏا دانَ
موتي ڪاريا مگڻي، طرح تُنبي ڪي تانَ
مون وٽ مال متاع جي، ڪمي آهي ڪانَ
ڪارڻ رَبّ رحمان، سِرُ وَڍِيي، سلطان! ڏي

(٨)

سِرَ جي ڌُنائين هليو، چارڻُ چتائي
سو مون ڄاڄهلي نه مال جا، تو ماڻڪ موٽائي
"تو دَرِ آئيس تي، جِئن تو ناهِ نه سِکيو"

(۷)

راجا جب راضی ہوا، خوب دیا تب دان
واپس دے کر گائک نے، اور لگائی تان
دولت کی کچھ کمی نہیں ہے، سن لے اے سلطان!
کارن رب رحمان، کاٹ کے سر دے اپنا

(۸)

سر کا کر کے دھیان، چلا یہاں سے گائک
دھن دولت اور ہیرے موتی، لٹاتا ہے مانک
"تو ہی ہے وہ لائق، جس نے نہ کہنا نہ سیکھا"

(٩)

پاسي پٽ ڪٽا، مون تان مورِ نه مَگِيو
تازي طبيلَنِ ۾، گھوڙا گھرِ گھٽا
هاٿيءَ ڪارڻِ هيڪڙي، آنُ ڪاتندُ ڍُٽان
جا مَٿي تو مٽيا، تَنهِنِ سِرَ جوا هيان سيڪڙو

(١٠)

"جي ميراثي مگتا، آئون پڻ منجهان تن"
"ڪي ڪهُ منهنجي ڪَنِ، اِرڏُث منجهاران اُنِ جي"

(۹)

"میں نے دامن پھیلا کر، دان کبھی نہ مانگا
اصطبل میں بندھے ہیں گھوڑے، جن کی نسل ہے اعلیٰ
نہیں کسی انعام کی خاطر، میں نے ساز ہے چھیڑا
مانگوں سَر پہ تیرا، سَر کا ہوں میں سوالی"

(۱۰)

"تو ہے گر میراثی منگتے! وہ ہی میری میراث
آن کے میرے پاس، کہہ تو اِرث اسی سے"

(١١)

ڪاجا ڳالهِ ٻُري، ٻيجليا! ٻڌاءِ مُون
پيئين جِتي گرنارَ ۾، تَنڊُنِ تانُ ڪري
ڪِ تو پَنڌُ پري، ڪِ مَتَّ جهلينديون، مڱڻا!

(١٢)

مَتَّ نه جهليان مُورِ هين، نه مون پنڌُ پري
ڳيئي آيسِ ڳالهڙي، ڳجهي تو ٻري
ساسمجهج سوڍي وَرَ! ويندُسِ ڪين وري
پريان پَير پَري، توڙ آئيو آهيان

(۱۱)

"بیجل! آج بتادے، مجھ کو تو یہ بات
آیا تُو گرنار میں، سُروں کی برسات
اب چاہیئے سوغات، یا دور سفر ہے تیرا"

(۱۲)

"دور سفر نہ میرا، نہ میں لوں سوغات
آیا ہوں گرنار میں، من میں بس اِک بات
من کا بھید سمجھ لے، جاؤں نہ خالی ہاتھ
دیکھ میرے حالات، دور دیس سے آیا ہوں"

(١٣)

مَڱَ نه تُنسي مڱڻُو، نه مِلڪ نه مالِ
ڏانَنِئُون ڏورِ ٿِئي، ڪاجا ڳِنسِ ڳالِ
آهي اِنَ خيالِ، ته ڏيني ٿِيان ڏاتارَ سين

(١٤)

سِرُ مڱي، سِرُ ڳُهري، سِرَ رِءَ ٿِئي نه صَلاحَ
غريبَنِئُون نه ڳذِريا، ٿو مارِي مِير مُلاحَ
نايو نوابنِ جا، سورِيو ڪيڏي ساهَ
خالِق سَنجهه صَباحَ ڪونه ڇڏِيندو ڪِٿهين

(۱۳)

نہ تو دان سے راضی ہے یہ، نہ ہی مانگے مال
دان نہ مانگے منگتا، کہے نہ دل کا حال
ہر پل یہی خیال، کہ قرب ملے داتا کا

(۱۴)

اور کرے نہ بات، سر مانگے ہر پل
مفلس ہوں یا راجا، سب کی موت اٹل
سب کے سیس نوائے، سب کا انت اجل
آج سویر یا کل، دھرے گا سب کو دھول میں

(١٥)

موٽي ، مَگَٽهارَ! شالَ مَ اچين ڪَڌهين
اَٿئي پَهَرَ اَجَلَ جو ، ڪُنڊ ۾ منجھ ڪَپارَ
جَنهن تو سَڀ ڄمارَ هَنيا ڇَتَ پٽن ۾ سين

(۱۵)

پھر نہ آئے در پر، لوٹ کے مانگنہار!
آٹھوں پہر اجل کی، کرے ہے تو گفتار
خاک میں تو نے یار! کیا کیا تاج گرائے

وائي :

تنهنجيءَ تند تنوارَ، يارَ! مُون مَنُ موهيو
مَلِهي آئين، مَگّٽا! گجي مِ گِر نار،
سَرِجي صَدا جِذِ تُون، ڏِيانءِ ڏيجَ اَپار
دان ڏيانءِ دُهرا، هزارين هزار
الا! عبداللطيف چئي، پسان پرينءِ پارَ!

وائی :

تیرے سُر اور تار، میرے من کو موہ گئے ہیں
آئے تھے گرنار میں تم، چھیڑ کے اپنے تار
گر تو سر کا دان نہ مانگے، میرے چارن یار
تیری جھولی میں بھر دوں، ہیرے لاکھ ہزار
سکھیو! شاہ لطیف کہے کہ، سُر میں دیکھوں یار

داستان ٽيون :

(١)

ڪِني جو بيجل ٻوليو، پِنيءَ ويهي پانَ
راجا رَتولَنِ ۾، سيبا ٽو سلطان
”آءُ منٿا هون مَگٽا! مُقابِلِ ميدان
گهوريان لَک لطيف چئي ٿنهنجي قَدَمَنِ تان قُربان
مَتوهيِيَ مِنزِمانَ! هلي آءُ نه هِتِ ڏِيَن ءِ

(٢)

آءُ مَنٿا هُون، مَگٽا، چڙهي ۾ چوڏولَ
توکي گهوٽ گهرائيو، راجا مَنجِهه رَتولَ
بيجل تو سين ٻولَ، وهاٽيءَ وَڏِڻ جبي

تیسری داستان :

(۱)

بھیگی رات تو بیجل نے، ایسی چھیڑی تان
سن کر رنگ محل میں، خوش ہوا سلطان
آجا اب تو پاس میرے، گائنک اے گنوان
کہے لطیف کہ لاکھوں سر، تجھ پہ ہیں قربان
آ میرے مہمان! آ تو دیدو دل سر

(۲)

چل تو اب محل میں گائنک! ڈولی ہے تیار
راجا رنگ محل میں، بلوائے ہے یار!
کرے گا وہ اقرار، تجھ سے سر دینے کا

(٣)

مَحلين آيو مڱڻو، ساز کڻي سُرندو
سَرجي صد اسُر ۾ گهور هڻي گهرندو
مَستي رِءَ مَلوڪ جي، چارڻ نه چُرندو
جهونا ڳڙهه جهُرندو، پوندي جهان جهروڪ ۾

(٤)

مَحلين آيو مڱڻو، کڻي ساز سِري
لڳي تند تنبير جي، پيا کوٽ ڪري
هندين ماڳين هو تي تنهنجي سيجل دانهن پري
سسي تنهن سلطان کان، اڄي گهوٽ گهري
جهونا ڳڙهه جهري، پوندي جهان جهروڪ ۾

(۳)

محل میں آیا گائک ، لے کر اپنا ساز
سُر میں ہوں گی صدائیں سُر کی ، باجیں گے پھر تار
سُر بن اب سلطان کے ، مانگے گا نہ یار
روئے گا گرنار ، محل میں ہوگا ماتم

(۴)

محل میں لے کر آیا گائک ، ساز وہ پراسرار
ایسے چھیڑے سُر کر سارا ، محل ہوا مسمار
سُن لیں سب نے صدائیں سُر کی ، ہر سُو ہاہا کار
راگی تو سر مانگ رہا ہے ، آن کے راجا دوار
روئے گا گرنار ، محل میں ہوگا ماتم

(٥)

ڏاتارَ ۽ مڱڻي، ڪو نه وسيلو وِچ
سائي تال تَنڌُنِ جي، سائي چارَڪُ چِتِ
جي هتي اجي هُتِ، ته ڳالهه مڙيائي هيڪڙي

(٦)

”جاجِڪ! تو جُهارُ، ڏَه پيرا ڏياچ چئي
جَنهنِ ۾ مالُ نه مِريَ جيترو، تَنهنِ تُون طمعدارُ
جي اچئي ڪَرِ ڪپارُ، ويهَ پيرا وَڃي ڏينءِ“

(۵)

راگی راجا بیچ رہا نہ، کوئی اور وسیلہ
بات جو تھی سائل کے من میں، سُر کی وہی صدا
پھیلی بات وہ ہر جا، جو گائک کے من میں

(٦)

تجھ کو کہوں جہار، دن میں دس دس بار
جس سَر کا ہے مول نہ کوئی وہ سَر مانگے یار!
سر کاٹوں سو بار، کام تیرے گر آئے

(٧)

ٻيلي ٻَٽي پارَ، جان مون نيٽ هٽي نهاريا
چوري رکيمِ چِتَ ۾، ڏسينِ جا ڏاتار
هِيُ سِرُ توهان ڏارَ، ٻيجي کنهن نه ٻوليو

(٨)

"سوجِيُ، مڱڻهارَ! مَر هوءِ جنهن توهٽي سَرِ سَتو کيو
جو مُون مل مُورِ نه سپجي، تان جي سو گُهرِ ٻوءِ
ته جُڳان جُڳَ ڏنوءِ، ڏنگو ڏاتارِنِ کي"

(۷)

ڈالی چاروں اور، میں نے ایک منظر
دھیان میں رکھ کر دیکھے، راجاؤں کے در
سُر پر دے جو سَر، تجھ بن اور نہ کوئی

(۸)

سَر بِن گر تم مانگتے، ایسا کوئی دان
اور نہ ہوتا پاس میرے، دینے کا سامان
کرتے تم بدنام، سارے جگ جہان میں

(۹)

”مُٺو مَٺائِين گهوريان، مٺو ٺو مٺان
سومون ٿئي نه هٿان، جنهن ٿون لائق، مگهٽا!“

(۱۰)

”مَٺو مَٺائين گهوريان، مٺو ٿو مَٺاءِ
هَٿ وهِئي هَٿِ ڪري، جاجِڪ! وَهِلو جاءِ
تون سين انيراءِ، جِمَ واچام وِلهو وَهين“

(۹)

تجھ پہ سَر قربان، یہ سَر تیرے صدقے
کاش وہ دیتا دان، جو ہوتا تیرے لائق

(۱۰)

تجھ پہ سَر قربان، یہ سَر تیرے صدقے
سَر میں کیا رکھا ہے گاتک! لے اب سَر کا دان
دیر نہ کر نادان! کر لے وعدہ پورا

(۱۱)

”مَٿو مُورِنہ پاڙيان، تنهنجي ۽ تَنُد تنوارَ
سِرَم سَڄڻُ ناهِ ڪي، موٽ مَ، مگڻهار!
ڪينهي منجهہ ڪپارَ، لڃنِد وٿو لاهيان“

(۱۲)

سوُ سِرن پائي، جي تَندُ برابرِ توريان
اُتَلَ اوڏانهِين ٿئي، جيڏانهن ٻيجل پرائي
سَڪِٽو هَـڏ آهي، سِرم سَڄڻ ناهِ ڪي“

(۱۱)

تیرے ساز سُروں کے، کہاں برابر سَر
سر میں کیا رکھا ہے، مانگ تو مال و زر
سَر تو ہے کمتر، لاج آئے سَر دیتے

(۱۲)

ڈالوں جب پلڑے میں، سر میں لاکھ ہزار
وہ ہی پلڑا بھاری جس میں تیرے ساز کے تار
سَر میں کیا ہے یار! مانگ کچھ اور اے منگتے

(١٣)

”مٿي اُتي منهنجي، جي هُوا سِرَنِ سو هزار
نَہ تنهنجيءَ تَندُ تنوار، هَرَ هَرَ وَ ڏيم هيڪڙو

(١٤)

مَٿي اُتي منهنجي، جي ڪوڙين هُوَنِ ڪپار
تَہ واريو واريو وَڍيان، سسيءَ ڪي سوار
تَہ پڻ تَندُ تنوارَ، مُوهان مٿائون، مگٽا!

(۱۳-۱۴)

گائک! اگر کندھوں پہ میرے، سر ہوں لاکھ ہزار
تیرے سُر کی خاطر کاٹوں، ہر اِک سَر ہر بار
تیرے سُر اور تار، پھر بھی اتم گائک!

(١٥)

جي تو ڏِيَٽُ، ڏياچَ! لاهيو اِي سِرسَيِ ڪو ڏي
ڪِي نا نِهِ جَهڙو ڏي، جو سَنڌ تَنِئِي سُواليين

(١٦)

ڏِيَٽُ گهٽو ڏِهلو، سِسِي ڏِيَٽُ سُک
سوتان، ڏياچَ! ڏُکُ، جو تَعَلُقُ رکي تَندُ سين”

(١٧)

جو تعلق رکي تَند سين، سو ڪِي پَلِئي پاءِ
مون ڪي مَرمو تاءِ، آئون آگاهون آئيو”

(۱۵)

جگ میں کوئی دے نہ پایا، ایسا دے تو دان
ہوگا تیرا مان ، گائک گِنوانوں میں

(۱۶)

سَر دینے میں سکھ ہے سائیں! دان ہے مشکل کام
ایسا دے تو دان، جس کا رشتہ تار سے

(۱۷)

جس کا رشتہ تار سے ، ایسا دے اب دان
پہلے سے پہچان ، ڈیا ج تیری ہے میری

(١٨)

پَسي پاٽ پُرِتيو، سَندوجادِمَ جُوڙُ
مَگَ وهائي ۾، مَگٽا! مٿوهيَر موجود
بَلڪِ آهي بُوڏُ، ناڪَسي ۾ نابُوڏَ ۾

(١٩)

چارَڻ چَنگ ڪُلهي ڪري، رَمي رَهيوراتِ
صَداجي، سَيّدچئي، وائي ڪيائين واتِ
ڏيه ڏِ ناٿهن ڏاتِ، ميين مگٽهار ڪيي.

(۱۸)

بھرا تھا خالی دامن، مکھ پر تھی مسکان
گاہک سر اب حاضر ہے، پھر لینا تم دان
جب فانی جسم و جان، سر دینا ہی بقا ہے

(۱۹)

ساز کو رکھ کندھوں پر، گیا وہ راگی رات
کہے لطیفؔ کہ کہے وہ ہر جا، اب تو ایک ہی بات
داتا نے دی دات، کیسی مجھ منگتے کو

(٢٠)

چارَڻ چَنگ ڪُلهي ڪري، پير پُٺي پاتا

صد اجي، سَيّدُ چئي، وائي ڪيائين واتا

تَنهن تي راڄُ راضي ٿيو، دِل وڏي ءَ داتا

مَرڪي مَرُماتا، روڙي راءِ ڏياچ جي

(۲۰)

ساز دھرا ہے کندھوں پر، اس کا دور سفر
اب تو ایک ہی بات کہے کہ دیا ہے دامن بھر
راضی ہوا وہ رائے جسکا، دل دریا و سمندر
ایسا بیٹا جن کر، مسکاتی ہیں مائیں

وائي :

مَتوم ڪنِڪارَ يار! ڏاڍَ ڏيندوسَن ڏِ، مَگَٽا!
جاجِڪَ ٻجهونا ٻَڙه ۾، هَل تِ ڏِيئُون يارَ،
مَتان ڪا منهنجي ڪرين، گلا جي گفتارَ
مَٿي اُتي منهجي، جي هُونِ سِرَ هزارَ
هَرهَر وَ ڍِيان هيڪِڙو تنهنجيَ تَندُ تنوار
لَڄيندي ٽولاهيان، ڪينهي منجهه ڪپارَ،
اديون! عبداللطيف چئي، ٻگيَسِ لَنؤ لَغارَ

وائی :

تجھ کو دوں گا دان اے یار! اپنے سر کا منگتے!
جھوناگڑھ کی جانب جائیں، ہم تم بن کر یار
سَر نہ دوں تو سارے جگ میں، گائک! کر لگا خوار
چارن! میرے پاس جو سَر ہوں، ایسے لاکھ ہزار
کاٹ لوں تیرے سُر کی خاطر، ہر اک سر ہر بار
لاج مروں میں دان میں دیتے، سَر اپنا بیکار
سکھیو! شاہ لطیف کہے ہے، راز بتائے تار

داستان چوٿون:

(۱)

رِءَ مصلحت مَگٽا، قَصَرِ کين اَچَڻِ
نور تجلو نُور سين، نِميو نيٽ پَسَڻِ
خيمي ۾ ڪنگهار جي، چاند وُٽا چِمڪَڻِ
لَڏ آئين، لطيف چئي، سَندا ڏان ڏِسَڻِ
تيلان مُلڪ ڏَٽين، مچيو مَگهار ڪي

(۲)

مَرُته آئين، مگٽا! مامَ پروڙي مون
جيڪا گاهه ڳالهائيين، سا سِپِ سمجهيسُون
تنهن ۾ تُسِج تون، جيڪا پوئي پَٽ ۾"

چوتھی داستان

(۱)

بھید بنا یوں رنگ محل میں، آتے ہیں کب راگی
نور تجلی نور کی، آنکھوں نے جب دیکھی
خیمے میں کھنگار کے، پھیلی نور تجلی
راگی پہ جب دان کی بارش، چاروں اور سے برسی
سب نے بات یہ سمجھی، مان گئے راگی کو

(۲)

اچھا ہی ہے آئے منگتے! سمجھ گئے ہم راز
ہم نے تو وہ بات سمجھ لی، کہے جو تیرا ساز
دان جو دوں میں بارہ! کر لے اُسے قبول

(٣)

”چارڻ اِتنهنجي چنگ جو، عَجَبُ آهِ اِيَّ
هَٿي اُلو هَٿن سين، جِٽرو رکيو جِيَّ
رات منهنجو رِيَّ، ڪاٽيو تو ڪُما ڇ سين“

(٤)

تان نه آهي تند جو رُون رُون ڪري راز
هَٿند ڙ سند اهتڙا، سيکو چِٽي ساز
سَت ڏيئي شهباز، تِبي ته ٽو ڪپرائيين

(۳)

دل کو کاٹ کے رکھ دیتے ہیں، تیرے ساز کے تار
حیرت ہے کہ اثر نہیں ہے، تیرے دل پر یار
رات دیا تھا مار، مجھ کو تیرے ساز نے

(۴)

ساز کی یہ آواز نہیں ہے، گونج رہا ہے راز
کیا جانیں یہ دنیا والے، اس کو سمجھیں ساز
جھپٹے جوں شہباز، پالے جو ہے پانا

(٥)

تَنَد تُماريءَ تانُ، کَھيو سو قبول ٻيو
سِرُ ته آهي سَٽِ ۾، پَرَ ٻيو کي مَڱِجِ دانُ
خاڪِ مِٽي ڪابانُ، ڪاتيا پوءِ ڪُجھ نهين”

(٦)

“چارَڻَ! ٻولِجِ ڪِي ٻيو، گُھرِيُءِ سو گھوريان
گُھرُ، سورَٺِ نه پَڙِيَ جان تَنڊُنِ برابر توريان
ٻُجھي آهِم ڳالھڙي، آءُ اوري، تان اوريان
ڪِ ڪُلَهِنئون ڪوريان؛ ڪِ جاجڪ اجسين ڏينءِ؟

(۵)

ہم نے کیا قبول، کہیں جو سُر اور تان
سَر تو وار دیا ہے گائک! مانگ کچھ اور اب دان
خاک ہے جسم و جان، سَر کاٹا تو کچھ نہیں

(٦)

مانگ لے اور بھی منگتے، وار دیا ہے سر
کہاں برابر سُر کے، سورٹھ اور یہ گھر
جو بھی بات چھپی ہے من میں، بات وہ مجھ سے کر
کاٹ کے دوں یہ سر، یا جسم بھی دوں یہ دان میں

(٧)

"چارَڪ چنگُ، ٻنگُ لهي، وَڃايوَ ڏاٽ
سِرَ جو هَڏِ آسان، پَر مگٽ هارَ مَٽي وَهي"

(٨)

ڳُجهه پنهنجي ڳجهه سين، رِنَد! رساڻي لاءِ
اَجَلُ اُيو آهِ، پِٽي ءَ تو پلاڻيو"

(۷)

بیجل نے پھر ساز بجا کر، چھیڑی ایسی تان
سر دینا آسان، وہ کچھ اور ہی مانگے

(۸)

ساز میں راز چھپا ہے، بن تو راز کا راز
موت کی اب آواز، گونج رہی ہے ساز میں

(٩)

وَڏِ سِرُ، ٿِيُ سَرَهو، مَرڪيو آءُ، مَرڳاءِ
جا جڪ تو مٿاءُ، مُلڪ مِٽَ ٻوئي گهوريان

(١٠)

تيئي پرچيا پاڻ ۾، تند ڪٽارو، ڪُنڊ
تَنهن جِهوئي ناهِ ڪي، جو تو چارڻ! ڪيو پِنڊ
اِيُ شُڪرُ اَلحَمدُ، جِتُن مَتو گهوريو، مڱڻا!

(۹)

کاٹ کے سر خوش ہو لے، نہ پھر آ نہ گا
یہ سر چیز ہے کیا، سب کچھ ہے قربان

(۱۰)

تینوں مل کر ایک ہوئے، سر کٹاری، تار
سر کا ایسا مول نہیں کہ کاٹے مانگنہار
اچھا ہے کہ یار! مانگا ہے سر مجھ سے

(١١)

ڪنجهي ڪيرت ڪينرو، واڄو وِلاتيءَ
هنئي تَند حُضور ۾، تنهن پارس پيرائتي
ڏسنديئي ڏياچ کي، ظاهر ٿيو ذاتيءَ
ڪَڍي تنهن ڪاتيءِ، وِڍو ڪَرَٽُ ڪَپارَ ۾

(١٢)

گُلَ چنو گرِنار جو، پَٽَڙ ٿيُونِ پٽيِنِ
سَهَسين سورَتِ جهڙيون اُپيُون اوسارينِ
چوتا چارڻ هَٿَ ۾ سِرُ سنيگاريو ڏينِ
نارِيُون ناڏ ڪرين، راجا راتِ رَمگيو

(۱۱)

سسکا ایک ایک سُر، ساز بجا لاہوتی
چھیڑا ساز حضور میں، پارس تھا وہ راگی
دیکھ کے رائے ڈیاچ کو، ظاہر ہوا وہ ذاتی
اور نکال کے کاٹی[1]، کاٹ لیا سر ڈیاچ کا

(۱۲)

گُل گرنار کا مرجھایا ہے، روئیں خاص و عام
روئیں سورٹھ، رانیاں، روئے شہر تمام
سر سجائیں، دیں راگی کو، لے اب سُر کو تھام
محل میں ہے کہرام، راجا لاد گیا جب رات

[1] کٹاری

(۱۳)

پاسَنگُ جَنهن پيشِ ڪيو، تنهن ڏِنو ڪين ڏياچ

مَٿو نيئي ماچ، وَڃي ڏورِ، ڏک ٿيو

(۱۴)

ڏنو ڪينَ ڏياچَ، ٿو سائِلَ سڪائيي

منهن تي موٽائيِ، مَٿو هڻيُس مَگَّٽي

(۱۳)

کوڑی مول نہیں ہے جس کا، ایسا دان دیا
گاہک پچھتایا، لے کر سر کا دان

(۱۴)

اصلی دان دیا نہ اس نے، مجھ کو ترسایا
واپس سر لایا، آن رکھا قدموں پر

(١٥)

سورتِ مُٺي، سُکُ ٿيو، خيما کنيان کنگهار
نه کو راڳ نه روپ کو، نڪا تَندُ تنوار
ٿِهان پوءِ مگڻهار، ڏنو سِرُ ڏيا ڄَ کيءَ

(١٦)

سورت مُٺي، سُکَ ٿيو، خيما هنيان کنگهارَ
ٿيو راڳ، روپ سو، لڳي تندُ تنوارَ
سو دَ ٿيون پَٽيبن يار، پسو راجا راضي ٿيو

(۱۵)

سکھ سورٹھ کی موت ہوئی، لاد چلا کھنگار
جب نہ راگ نہ روپ تھا، نہ ہی سُر نہ تار
لاکر سَر تب یار! دیا تھا رائے ڈیاچ کو

(۱۶)

سکھ سورٹھ کی موت ہوئی، لاد چلا کھنگار
وہ ہی روپ تھا راگ وہ ہی، باج اٹھے تھے تار
دھرتی کے اس پار، راضی تھا تب راجا

وائيِ :

اَلوِداع ورا اَلوِداع، جاني ڪيوءِ جدا
هي ءِ هي ءِ سورٺِ ٿئي ساري
هڻ تون تند طريق جي، واڄٽ سڀ واري
سورٺ سرتين وچ ۾، اُٿي اوساري
ڏيندو سان ءِ ڏياچ جي، هِنُي سر سيند ڳاري
هي جو آيو مڱڻو، سو متارا ماري
دوس دوسنيئان دور ڪيو، تو ڏيا ڏيڪاري
ڪند منهنجو ڪاٽيو نينهن سندي نعري

وائی :

الوداع رے الوداع ، جانی ہوا جدا
تم سورٹھ کے تھے پیارے
گا اب راگ طریقت کا، بھول تو سُر سارے
سورٹھ، سکھیاں سسک رہی ہیں، چلا وہ راجا رے!
اپنا سَر میں سجا کے دوں گا، سُر تو مہکا رے!
من تو رشتے ناتے بھولا، لاگیں سُر پیارے
دیکھ یہ کیسا راگی ہے، سر سے جو مارے
سُر میں ملی صدا ساجن کی، جس نے مارا رے

[م جھ ر ل]

MP—866—01

SUR SORATH

"Sorath" is both a raga and a narrative tradition in Sind. Shah Abdul Latif Bhitai arranged his work according to different ragas. Some of these are arranged according to classical ragas and they are sung in these ragas. Other ragas with classical names have been attributed to folk narratives. Thus the "sur sorath" indicated by this great Master is the name of a classical raga, but it is used to sing the famous folk narrative of Sind called "Sorath Rai Dyach". The original text with a poetic Urdu translation in parallel text is presented in this volume.

دیکھ کر میرے رنجیدہ چہرے کو کیوں
رنگ خوشیوں کا یا رو ہوا ہو گیا

ظُلم کی رات تھی جہل کے رُوپ میں
فرض اپنا بھی لیکن ادا ہو گیا



سِتم کے نگر میں کرا دو مُنادی
کہ ہم نے چوراہے میں تربت سجا دی

لہُو رنگ خاکے میں ڈھلتی گئی وُہ
اندھیری سحر کو جو ہم نے سزا دی

ہمیں صبر کے راستوں پہ نہ ڈالو
کہ ہم نے مُقدّر کی بستی اُٹھا دی

کہو موت کی شام سے آج نکلے
کہ ہم نے صلیبوں پہ ہستی لُٹا دی

ذرا سوچ کر ہم سے آنکھیں مِلانا
کہ ہم نے مُروّت کی عادت بُھلا دی



میں نے کب کہا سجن رات غم کی کٹ گئی
آ کے میرے دوار سے روشنی پلٹ گئی

کوئی کیا جواب دے اب تیرے سوال کا
آج میری آنکھ میں خامشی سمٹ گئی

زندگی کے قہر سے ڈر کے بھاگتی ہوئی
موت کی اداس شام مجھ سے آ لپٹ گئی

کیا کہوں میں ساتھیا رائیگاں کی دھوپ جو
ڈس کے میری خواہشیں کرچیوں میں بٹ گئی

ماتموں کا ساز کیوں حسرتوں کی لاش پر
سانس کا چراغ تھا درد رُت الٹ گئی



پلکوں کی سنگین اٹھاؤ
ظلم خداؤں کو تڑپاؤ

آگ دھوئیں کا راج امر ہو
یوں شعلوں کے شہر بساؤ

برف کے سینے میں سورج ہو
کچھ ایسا ہی رنگ جماؤ

آزادی زنجیر ہوئی ہے
دار نگر میں دھوم مچاؤ

موت نے مسیح کو پھر سے پکارا
بالی جی تم توڑ نبھاؤ



مُسکراہٹوں کا رنگ اِس قدر مچل گیا
میں پلک پلک تلک آنسوؤں میں ڈھل گیا

آج کیوں صدائیں دُوں رَحم کے خداؤں کو
میرا اعتقاد تو حَرف حَرف پگھل گیا

سانس سانس آگ ہو اَب یہی ہے آرزُو
میں قفس اُجاڑ برف سے نِکل گیا

میری آنکھ کے خلا ویراں گر ہُوئے تو کیا
زندگی کے گاؤں سے کب کوئی سنبھل گیا

جس کو دیوتا سمجھ من میرا جُھکا کبھی
باؔلی جی وہی اُسے پیار سے کُچل گیا



رونے کے لئے ہم نے خدا ڈھونڈ لیا ہے
اَب تم ہی کرو فیصلہ کیا ہم نے کیا ہے

اِنکار کی سیڑھی پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
اِقرار کا پتھر بھی میرے پاس پڑا ہے

آنکھوں سے پگھلتے ہوئے شیشوں کے بہاؤ
شعلوں کی جلی لاش پہ ماتم سا بپا ہے

اَب خاروں کے زخموں کا گِلہ کاہے کریں ہم
سینوں سے بہاروں کا جنازہ ہی اُٹھا ہے

ہونٹوں پہ دبی سانس تو پہلے ہی تھی خاموش
ماتھے پہ دھڑکتا ہوا سورج بھی بجھا ہے

آنکھوں میں نِراشا کے دِیئے گرچہ ہیں روشن
من میں تو میرے آس کا اُستھان رہا ہے

دم توڑتے صُبح کے سِتارے نے خبر دی
راتوں کے مُقدّر میں سویروں کی ہَوا ہے



تنکوں کے آسماں کو خُدا جان لیا تھا
کیوں تشنگی کا خوف دُعا مان لیا تھا

پتھرائے مندروں سے نہ تو آسکا صنم
ہم نے تو ہستیوں کا دُھواں چھان لیا تھا

پلکوں میں برچھیوں کا نگر جاگتا رہا
دِل نے خموشیوں کا نشہ تان لیا تھا

روشن سیاہ رات کی پائل ہے چُور چُور
کاہے کو ساتھ موت کا سامان لیا تھا

سوچوں کی دھڑکنوں کا جہاں چھانتے ہوئے
اِس دِل نے پتھروں سے بھی تاوان لیا تھا

ویرانیوں کے جال نے تانے بُنے مگر
رستے میں بستیوں نے مجھے آن لیا تھا

باالی حقیقتوں کا نہ ادراک ہو سکا
اُجڑے مُقدّروں کو تو پہچان لیا تھا

○



تُلے موت رانی عوضِ زِندگی کے
لہُو کے جزیرے وطن آشتی کے

کہُر کے قفس سے صدا ایک اُبھری
ہیں سوُرج کے سر پہ گِلے روشنی کے

لِکھا تھا بہت کچھ ہی لمحوں کے مُکھ پہ
نظر رہ گئی کیوُں نگر بے بسی کے

جو ریشم کی دھاروں سے ٹپکے پسینہ
لہُو رو گئے ہیں بدن آدمی کے

جہاں چھُپ کے آنچل نے سائے بچھائے
قدم شل ہوُئے کیوُں وہیں آگہی ہے



لہو سے چُنیں زندگی کی عمارت
نہ ہوگی ستم کی کبھی اب عبادت

جواں سر سجادو چور ہے چور ہا ہے
کہ مُردہ رگوں سے نہ ہوگی بغاوت

ستم کو ہے کاٹا ستم سے ہمیں نے
ہمیں تو کبھی آ سکی نہ شرافت

کوئی بادشاہ کوئی دار و رسن پر
یہ انساں ہی انساں میں کیسا تفاوت

گئے کل کی مٹی ہوا میں اُڑا دو
نئی زندگی نئی صبح سے عبارت



چاندنی کے شہر پہ تاریکیوں کا راج تھا
رات کے شمشان گھر میں شمس کا اِندراج تھا

سبز رُت کی کونپلیں یہ دیکھ کر مُرجھا گئیں
بانجھ نسلوں کا جزیرہ دُلہنوں کا داج تھا

روشنی کے سُورجوں کی ہر شعاع اپنی نہ تھی
ایک ذرّہ ہی ہماری محنتوں کی لاج تھا

پیار کی بیدار راہوں کے اُجالے کہہ گئے
ظلمتوں کی سرزمیں کا ہر قفس تاراج تھا

بے حسی کی دُھوپ تھی ہم مُعجزہ سمجھے جسے
باکی سوچوں کے لہو میں آگہی کا تاج تھا



برکھا برکھا نظر ایسے مُسکا گئی
شعلہ شعلہ جبیں زندگی پا گئی

پتھروں کے بدن میں دراڑیں پڑیں
چُپ کی آنکھوں میں یُوں روشنی آ گئی

صبح کی کرنیں سُنائیں فسانے نئے
رات سُورج کے آنگن میں شرما گئی

خوف نے جال نکتوں کے لاکھوں بُنے
آگہی سب لکیروں کو بکھرا گئی

ہم نے ہاتھوں میں تیشے اٹھائے نہیں
ظلم پیکر کی دھڑکن کیوں پتھرا گئی

زِندگی کے نگر سے شرارے اُٹھیں
سبزہ سبزہ ہوا آگ برسا گئی

موج کی آنکھ میں گاڑ دو برچھیاں
ساحلوں کے نِشاں آشتی کھا گئی

بانجھ صدیوں نے ریزہ فصیلیں چنیں
خُشک بالی کے مُکھ پہ نمی چھا گئی



دُھوّیں آگ میں کیسے شکوے گلے
لہُو کے نگر آشتی میں جلے

جلُو میں تباہی و کہرام لے کر
سِتم اژدھے موت رہ کو چلے

کبھی رات میں بھی نہ تھمتے تھے جو
وہی اشک شعُلہ سحر میں ڈھلے

بغاوت بغاوت دھڑکنے لگے
روایت کی کہُنہ گلی میں پلے

دبی آنکھ میں مُسکرائے ہنسے
ادا روشنی کی کہُر کے تلے

غموں کی چٹانوں سے رِستے ہوئے
ہمیں مُسکراہٹ کے جھرنے ملے

اندھیروں کی دھرتی پہ چھانے کو آج
بالی جی سانسوں بیں سُورج پھلے



ریزہ ریزہ سُورج کو چمکائے گی
قطرہ قطرہ شام لہُو برسائے گی

چال حنا کی دِھیرے دِھیرے اُٹھی ہے
کاغذ کاغذ شکلوں کو بھڑکائے گی

نیلی آنکھیں، لالی لالی جاگی ہیں
اندھی روشن رُت جیسے پتھرائے گی

دیوی سُکھ کی، دھرتی دھرتی اُتری ہے
آنسو آنسو بستی کو مُسکائے گی

جنگل جنگل لرزہ لرزہ کانپے ہے
راون راون سیتا آگ لگائے گی

جیون آشا، ہوا ہوا لہرائی ہے
موت سمان خداؤں کو دفنائے گی

اگنی رانی ہونٹوں میں مُسکائی ہے
باؔلی جی کے من میں آن سمائے گی

○

قطره قطره شام



آنکھ کے دائروں میں سمٹا ہُوا
دَرد کا شہر مُسکراتا تھا

دِل کے سنّاٹے کر گئے پتھر
ورنہ رونا ہمیں بھی آتا تھا

میری ویرانیاں نہ دیکھ سکا
چاند بدلی میں چھُپا جاتا تھا

جو حقیقت میں ساتھ چھوڑ گیا
خواب میں مجھ کو کیوں بلاتا تھا

مَن کے مندر کا بُجھتا دیپ کوئی
درد کی آنچ پہ جلاتا تھا



میں نے اشکوں سے جو تراشا بدن
قہقہہ رنگ ہو کے جلنے لگا

دِل، کہ پتھر تھا ایک مُدّت سے
درد کی آنچ سے پگھلنے لگا

پھر کوئی حادثہ نہ پیش آئے
سانس کیوں تیز تیز چلنے لگا

موت ہی اب نہ ہو کنارا کہیں
صبر میرا جنوں میں ڈھلنے لگا

لَب پہ بے ساختہ ہنسی جاگی
شاید ارماں کوئی نکلنے لگا



الوداع دوستو الوداع ساتھیو
ہم تمہارے ہیں رہنے کے قابل نہ تھے

تم کو کیسے بھلا ہم دکھاتے خلوص
ہم کسی کی اُمنگوں کے قاتل نہ تھے

کیوں نہ اپنی نگاہوں سے گرتے بھلا
ہم کسی کی وفاؤں کا حاصل نہ تھے

خار نظروں نے اُن کی بتایا مجھے
سبز قدموں سے میرے وہ غافل نہ تھے

آپ کی آنکھ سے ہیں رواں اشک کیوں
آپ تو میرے جرموں میں شامل نہ تھے



نفرت سے الگ اُلفت سے جُدا
ہم دیار کوئی اپنائیں گے

دِل تڑپ تڑپ کر مر جائے
تیرے دوار کبھی نہیں آئیں گے

تم دیکھو گے اِک دن حسرت سے
ہم بیگانے بن جائیں گے

مِلا پھول نہ کوئی گلشن سے
کانٹوں ہی سے گھر کو سجائیں گے

آئی نہ حقیقت راس ہمیں
خوابوں ہی سے جی بہلائیں گے

لیا اپنے ہی ہاتھوں خود کو مٹا
اب اور وہ کیا منوائیں گے

ہر جذبے سے ہو کر ہم خالی
سوچا ہے کہ اب پتھرائیں گے

○



رحم کے تیر نہ چھوڑو ہم پر
ہم ہیں نفرت سے بہلنے والے

تم جلانا نہ اُمنگوں کے دِیئے
لوگ ہیں رُوپ بدلنے والے

نفرتوں کا نِشان ہوں گے کبھی
پیار کے پھُول مسلنے والے

زہر میں بُجھتے چلے جاتے ہیں
تیری محفِل سے نکلنے والے

ایک ہنگامہ ہُوا کرتے تھے
شہرِ خاموش میں ڈھلنے والے

برف سے مثلِ شرر اٹھیں گے
درد کے گاؤں میں پلنے والے

ہم نے پتھراتے ہوئے دیکھے ہیں
آگ کی دھار پہ چلنے والے



لوگ تو ہیں خوف کے زِنداں میں بند
خود ہی اپنی لاش پہ ماتم کریں

پا چُکے ہم زِندگی کے راز کو
پتھّروں سے کیوں نہ اب سنگم کریں

ہو بھی جائے زِندگی کی سانس شَل
آؤ غم کو اور کچھ بَرہم کریں

بھُول جائیں زِیست کا جَلتا چراغ
تِیرگی کو آج پھر ہمدم کریں

جَل نہ جائے ظُلم کی دُنیا کہیں
سوچ کی لَو اور کچھ مدھم کریں



زنجیریں پگھلا کر کوئی نس نس میں
آزادی کے گیت سنانے آیا ہے

محکومی کے چاند سجا کر آنکھوں میں
کوئی ہماری آس بندھانے آیا ہے

ماتھے پر اندھے شمسوں کا نور لئے
کوئی ہمیں منزل پہنچانے آیا ہے

نگینوں میں پھول پرو کر خوشیوں کے
کوئی ہمارا درد مٹانے آیا ہے

ہونٹوں پر بکھری مہکار گلابوں کی
کوئی ہماری پیاس بجھانے آیا ہے



آگ کی کشتی کی منزل راکھ کیوں
سوچ کی منجدھار کا ہر پَل کہے

پھَٹ پڑیں گے ایک دن آتش فشاں
چیختی چُپ چاپ کی ہلچل کہے

گوری چِتون پر پھری برہن لکیر
کاری انکھیوں کا اُڑا کاجل کہے

خُون کی لہروں پہ مسکن ہے میرا
آشتی کا ٹُوٹتا ساحل کہے

خُونچکاں تاریک نگری دیکھ کر
روشنی لاؤں کہاں سانول کہے

آئینے میں جو دِکھائے آئینہ
شہرِ بابا کی اُس کو کیوں پاگل لکھے



نفرتو آؤ گلے سے مِل لیں
پیار کا مرتا نشہ دیکھا ہے

حسرتو اُبھرو ابھی جانا نہیں
میں نے پھر خود کو بُلا دیکھا ہے

آج بھی تم ہی میرے سامنے ہو
یاد کو تیری بھلا دیکھا ہے

زندگی تیرے مقدّر کی قسم
موت کا میں نے خدا دیکھا ہے

برف ہوں پھر بھی کھلی آنکھوں سے
درد کو ہوتے سوا دیکھا ہے

کِرن کِرن اُجالے

لمحوں کا دُکھ

ایک لمحہ،
کئی صدیوں میں بکھر جاتا ہے،
جب کبھی گزُری ہُوئی کل کا خیال آتا ہے،
کل !!
کہ دامن میں چھُپائے ہُوئے مُردہ لمحے،
وقت کی قبریں دفنا کے جنہیں بھُول گئی،
برف کے کوہ بنے اُبھرے ہیں،
آج کے چہرے پہ ہیں،
مرتے ہُوئے چاند کی لاکھوں کرنیں،
یاس و اُمید کے سنگم پہ کھڑی سوچتی ہیں،
صُبح کی پہلی کرن،
اِن کا جنازہ ہو گی !!!

انتظار

تیری گلیوں میں بھی آ کر
اِس قدر ڈرتے رہے
مُنتظِر لمحے کی مانند
زِندگی کرتے رہے

زرد پتّے

خِزاں کے مارے،

یہ زرد پتّے،

بِکھر کے جانے کِدھر کو جائیں ؟

کِسے بُلائیں ؟

کوئی نہیں ہے،

جو اِس جہاں میں،

یہ زرد پتّے،

گلے لگالے،

بُریدہ ٹہنی پہ گُل کھِلالے !!!

تلاش

ڈُھونڈنے نکلو !
تو مِل جاؤں گا ،
کہیں نہ کہیں !
کاغذی پھُول ہُوں ،
رنگوں سے ،
مُبرّا تو نہیں !!!

خامشی

دِل کے سناٹوں کے آگے،
رات کی چُپ،
کچُھ نہیں!!

اِدراک

تیرگی کے آسماں پر
خوُن کی روشن لکیر،
پھیل کر
صبُح کا اُجالا ہو گئی !!

زندگی

رقص ہے،
زِندہ لاشوں کا،
لاشوں کی کچھ خواہشوں کا!

تجربہ

دوستی کی آنچ سے
میرا نشیمن،
جل گیا!!

احساس

لُٹتے ہی رہے ہر بار
مگر تیرا پیار چُبھن تھا
کانٹا رہا
کہیں کِس سے بھلا
مانے گا کوئی
احساس کا من میں گھاٹا رہا
دُور تجھ سے رہوں، اور زِندہ رہوں ؟
اِک کہانی تھی
دِل میں وِیرانی سے پہلے
جوانی سے پہلے

ہوا آئی غم کی بکھرنے لگی
خزاں کے بدن میں نکھرنے لگی
ایک راہبہ بنی
اور ننگی حقیقت کی مانند جلی
تھی وہ رُت من چلی

صداقت

دیویاں ظُلم کی حسنِ پیتھرؔ لئے
آگئیں پیار کا
رُوپ بھرتے ہُوئے!
چال چلتے ہُوئے
تم امیدوں کے پھُولوں کو
چُننا نہیں
خواب بُننا نہیں
دیویاں ظُلم کی پیار کی تیغ ہیں
نفرتوں کے زہر کو سموئے ہُوئے

غم پروئے ہُوئے
کاٹ دیں گی جِگر کو تمہارے سُنو،
نہ اُمیدیں بُنو،
کہ اُمیدیں
اَجل کا ہی اِک نام ہیں
درد کی شام ہیں !!!

مصلحت

بے حسی کا تاج سر پہ
لب پہ خاموشی کے گیت
کان میں
گالے رُوئی کے
تَن میں سانسوں کی چبھن
میں نے دیکھا
زندگی کو اِس طرح بھی
موت کے اہرام میں !!!

دیش نِکالا

تم خوشیوں کے نغمے ڈھونڈو
میں خود پر بھی
بَین
لمبی ہو گئی رَین!
میری تیری
سوچ جدا ہے
میرے تیرے
خواب الگ
میں تو ٹھہرا پریم پجاری
تم نفرت کی مالا
دے دو دیش نِکالا؟

خُدا کی بستی

حنوط شدہ
لاشوں کا مسکن
ٹھٹھری امنگوں کی مہکار
لوگ کہیں جیون سنسار!

بشارت

چیختی،
چنگھاڑتی،
پاگل ہوا،
آرہی تھی چار سو،
دُور ویرانے میں اک چھپّر گرا،
وقت نے نعرہ دیا،
آسماں پر جو خدا تھا،
مر گیا!!!!

آرزو

بندر بدن میں
ہے آدم مقید
کوئی آ کے
اس کو رہائی دلائے
کہ یہ مسکرائے
!!

سوداگر

خشک ہوکا
ہوں بیوپاری
پیلے چہرے بیچوں گا
لفظوں کا دُکھ
سینچوں گا!!!

ریزہ ریزہ گیت



پریت کی رِیت سجنوا آج نبھائی نا ہنہ
آشا کی چھب مَن درپن کو بھائی نا ہنہ

میں پاپن تھی مُنہ کالا کر دُور بھئی
اپنے ہی کرموں سے بھگون چور بھئی
لاج کی ماری شرن تمہارے آئی نا ہنہ
آشا کی چھب ------------

آنسوؤں پیتی اک یُگ سے میں جنم جلی
پریتم کی نگری سے کتنی دُور چلی
برہا کا دُکھ میں ہونٹوں تک لائی نا ہنہ
آشا کی چھب ------------

آج کدھر پھر ہیمنت کا سنگیت اُٹھا
سپنوں کی گلین سے بسرا میت اُٹھا
مَن بگھیا کی کلی کوئی مُسکائی نا ہنہ
آشا کی چھب ------------



برہن اکھیاں روئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس ڈبوئیں کیوں

ریزہ ریزہ گیت کے جال
بکھرے بھٹکے میت سنبھال
ساگر ساگر کھوئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس -----

چُپ ٹیلین سے بولوں گی
پریتم کے سنگ ہولوں گی
آنسوؤں پیاس بھگوئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس -----

من مندر پہ گھور کی چھایا
درپن درپن داغ کی مایا
تن میں یاس پروئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس ـــــــ

چُپ گھونگھٹ کس کارن ری
بجھتی رین بھکارن ری
سُکھ آنچل میں سوئیں کیوں
دُکھ دُکھ آس ـــــــ



دُکھ مندر کی داسی ہُوں میں
انتر گھٹ تک پیاسی ہُوں میں

آشا کا استھان ملے نا ہنہ
انسوُن کو نروان ملے نا ہنہ
خوشیوں کی بن باسی ہُوں میں
انتر گھٹ ----------

شام سمے کی مرنے آئی
درپن ارپن کرنے آئی
تجھ بن شام نراسی ہُوں میں
انتر گھٹ ---------

سُکھ مُسکان کو جانوں کیا
تجھ بن چھایا مانوں کیا
ساجن گھور اداسی ہوں میں
انتر گھٹ---------

آئی بسنت کھلیں ناہنہ کلیاں
تجھ بن سونی سونی گلیاں
دیکھ ملن کی آسی ہوں میں
انتر گھٹ--------

اگنی رُوپ بھی بھر سکتی تھی
ساجن یہ سب کر سکتی تھی
بالی جی چپ واسی ہوں میں
انتر گھٹ-------



تو نے جانا، میں نہ جانی
ساجن کیسی پریم کہانی

دُکھ دُکھ پاؤں ٹوٹ گئے
تم کِس گاؤں رُوٹھ گئے
میں پگلی، بِرہن دیوانی
ساجن کیسی ------

یُگ یُگ ارپن کرتی آئی
دَھک دُھک دھڑکن ڈرتی آئی
تُجھ کو چاہا۔ کی نادانی
ساجن کیسی ------

چتون پہ لَٹ شور مچائے
پِیتم ٹھہرا بھور ستائے
تُو نے کرنی تھی مَن مانی
ساجن کیسی -----



پگلے لوگ نا ہنہ جائیں ڈر
دُکھ مُسکائیں ہونٹوں پر

سُونی سونی گلیوں میں
کاغذ کاغذ کلیوں میں
کب جاگیں گے خوشبو گھر
دُکھ مُسکائیں -----

بیتے یگ کا ساز ملے
لہو لہو آواز ملے
من مندر میں جھانکیں گر
دُکھ مسکائیں ---

تم نا ہنہ آؤ میں آؤں گی
پتھر پتھر ٹکراؤں گی
بڑھنے لگی اب آس ڈگر
دُکھ مسکائیں -----



رنگوں کے سنگ اڑیں الہڑ کہانیاں
پیتم کی ڈور پہ پیت کی نشانیاں

گڑیا کے سر سے چنریا اڑائیں گی
گڈے سے راجہ کو من میں بسائیں گی
بچپن کے ہالوں سے تکتی جوانیاں
پیتم کی ------------

نینوں میں کجلوں کے سپنے سجائیں گی
ماتھے پہ ڈولے کا ٹیکہ لگائیں گی
کر کے سنگھار اٹھیں جوبن کی رانیاں
پیتم کی ------------

چنچل پوّتوا کو گھنگھرو بنائے کے
بدرا کے انگنا میں میلہ لگائے کے
ناچیں گگنوا پہ کلیاں سہانیاں
پیتم کی ---------

لاہور شہر دے اینکلے، نویکلے تے نڈر شاعر

بالی جی

دیاں پنجابی نظماں، غزلاں تے گیتاں دا مجموعہ

اکھراں دی جھاتی

جنہاں دا قلم

ہسدے ہنجو، روندے ہاسے، بھکیاں سدھراں
تڑدیاں پھردیاں لاشاں توں کج دے گڑتے لاہندا
چم دی تانیں چدر چوں سکے جثے وخاندا

تے

دکھاں دے ہنیریاں نوں لیر لیر کردا
سکھ سنہوڑا دیندا

(چھیتی چھپ رہیا ایہ)

لوکاں دے چھیڑے چھانجے لوکاں دی اپنیں بولی وچ

لوک کلا پبلیکیشنز احاطہ اسلام دین لنڈا بازار لاہور

لمحوں کا دکھ



برکاتؔ شہید کے نام

دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا
شمس اندھا ہُوا دِن سیاہ ہو گیا

کاٹ کر عصر کے تنُد ہاتھوں کو میں
آگہی کے نگر کا خُدا ہو گیا

تُو کہ ہستی میں بھی نیست ہو کر رہا
مَیں فنا میں اُتر کر بقا ہو گیا

ہم اندھیروں میں اب بھی بھٹکتے ہیں کیوں
صُبح کا تارا تو کب کا فنا ہو گیا

مصلحت کے مُصوّر تو جاگے کا کب
ظُلم پہلے سے بھی اب سوا ہو گیا

لوگ کھاتے ہیں خوف درپن سے
ہم نے کاہے کو شاعری کرلی

مل کے ہم سے نہ جان پایا کوئی
سب میں شامل ہیں، پھر بھی تنہا ہیں

جس نے گھر کو کبھی لوٹنا ہی نہیں
کون دیکھے گا ایسے مسافر کی راہ

ترتیب

مصلوب نسل کا شاعر

جب رات بھیگ جاتی ہے اور ایک ایک کر کے دُکانیں بند ہونے لگتی ہیں۔ لوگ گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سڑکیں یوں ویران ہو جاتی ہیں، جیسے کبھی آباد نہ رہی ہوں — تو ایک عجیب سی اداسی پرانے شہر کی تاریک گلیوں سے نکل کر چاروں طرف بہنے لگتی ہے۔ پھر ہانپتی سڑکوں کے کنارے محض میونسپلٹی کے الیکٹرک پولز مردہ روشنی بکھیرتے، برہنہ کھڑے سسکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور آخری تاریخوں کا زرد چاند، اونچی اونچی نیم تاریک بلڈنگوں پر چمکتا ہے اور ہوا یوں بَین کرتی چلتی ہے جیسے سنسان سڑکوں کا نوحہ پڑھ رہی ہو۔

اس سمے کبھی آپ کا لاہور کی ویران سڑکوں پر گذر ہو، تو دُور دُور تک بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی سڑک کے کسی تاریک موڑ سے اچانک ایک نقطہ سا رینگتا، آپ کی طرف آتا ہُوا دکھائی دے گا۔ جو بڑھتا، لہراتا ڈولتا ایک کمزور سے انسانی ہیولے میں مُتشکّل ہو جائے گا۔ اور قریب آنے پر آپ جس کے چہرے پر بیتے لمحوں کا دُکھ آسانی سے پڑھ لیں گے۔ اس کی ویران آنکھوں کی بجھتی جوت آپ کو اداس کر دے گی اور جس کے شعر سُن کر انسانی دُکھوں، حسرتوں اور آرزوؤں کی ایک پوری دنیا آپ کے سامنے برہنہ ہو جائے گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شخص آپ کو جانا پہچانا سا لگے جس کے الجھے ہوئے کپڑوں پر کسی پارک کی سوکھی گھاس کے تنکے اٹکے ہوئے ہوں گے۔ بال خشک اور پریشان ہوں گے۔ جلتی آنکھوں میں اندیکھے سپنوں کی راکھ لئے، جو آخرِ شب کی تیز ہوا میں سُوکھے پتے کی طرح بے بس اور مجبور نظر آئے گا۔ لیکن اس کے خشک ہونٹوں

"احمد فراز کے انجام کو
مدِّنظر رکھتے ہوئے، کوئی
سرپھرا ہی اس کتاب پر
اظہارِ رائے کی جسارت کر
سکتا ہے۔"

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

قیمت : ۱۵/- روپے

بھرپاسی مسکراہٹ کی وراڑ میں سے معصومیت کچھ اس طرح سے جھانکے گی کہ ایک تیز اسرد لہر پورے وجود میں گھومتی، سرسراتی، چکر لگاتی، آپ کے رونگٹوں میں کھڑی ہو جائے گی۔

ہاتھ میں سلگتا سگریٹ اور ہونٹوں پر اشعار کی کجلائی ہوئی قندیل لئے یہ شخص ——— یقین کیجئے، یہی باقی جی ہے۔ جس نے دن کی روشنی چھوڑ کر، رات کے گنجان اندھیروں کو اپنے وجود کے گرد کمبل کی طرح لپیٹ لیا ہے۔ جس کے اشعار سُن کر آپ باوجود کوشش کے بھی، ہنس نہ پائیں گے اور لاکھ جتن کرنے پر بھی رو نہ سکیں گے۔ کیونکہ انسانی دکھوں اور محرومیوں کی چوکھٹ چوکھٹ گڑھی صلیبوں پر صرف باقی جی ہی نہیں۔ آج ہماری پوری نوجوان نسل مصلوب ہے اور باقی جی اسی مصلوب نسل کا حساس شاعر ہے۔

باقی جی سے میری پہلی ملاقات خاصے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ محض اقبال بٹ تھے اور دوستوں کے حلقے میں "ایبسنٹ مائنڈڈ پروفیسر" (ABSENT MINDED PROFESSOR) کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ اپنے اچھے خاصے وسیع علم کے بل بوتے پر وہ میرے احباب کو ناک چنے چبوایا کرتے تھے۔ ان کی تعریفیں سُن سُن کر جب بقول شخصے میرے کان پک گئے تو ایک دن دوستوں نے پکڑ کر ملاقات کرا دی۔

پہلی نظر میں وہ مجھے ایک کالج کے عام سے طالب علم دکھائی دیئے (حقیقتاً وہ ان دنوں کالج میں پڑھ رہے تھے) جو کالج سے بھاگ کر فلم کا اسپیشل شو دیکھنے کی بجائے، دوستوں میں بیٹھا سیاسیاتِ عالم پر لیکچر ہانک رہا ہو۔ ظاہری حلیہ خاصہ "ٹھیک ٹھاک" تھا۔ مگر اُن کی ہر حرکت اور انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کی زیادہ پرواہ کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ یہی لاپرواہی اور لااُبالی پن بچپن ہی سے ان کی شخصیت کا جزو رہا ہے۔ جہاں اس نے کبھی کبھار انہیں فائدہ بھی پہنچایا، وہاں نقصان بھی۔ اب تک اُن کی گمنامی میں اس عادت قبیحہ کا بھی پورا پورا ہاتھ ہے

اسی ملاقات میں پتہ چلا کہ شعر و ادب سے بہت لگاؤ ہے۔ ترقی پسند ادب تو انہوں نے جیسے گھوٹ کے پی رکھا ہے۔ ساحر اور کیفی اعظمی سے شدید متاثر تھے۔ اچھی طرح یاد نہیں شاید انہوں نے ان شعراء کا تازہ کلام بھی سنایا تھا۔ خود ابھی شعر کہنے شروع نہ کئے تھے تاہم چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے کے خبط میں مبتلا تھے۔ جو بدقسمتی سے کبھی چھپ نہ سکیں (وہی لاپروائی اور لااُبالی پن) مگر چند کہانیاں جو میں نے اُن کے منہ سے سُنیں، ان میں لفظوں کی جرأت اور امیجری نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور مجھے احساس ہوا۔ کہ یہ چھریرا سا عقابی ناک والا لڑکا

اپنے جسم میں ایک شاعر کی رُوح رکھتا ہے۔

اس اچانک ملاقات کے بعد باقی جی سے اکثر ملاقاتیں رہتیں۔ اگرچہ ہم ابھی ان حدوں تک نہ پہنچے تھے جہاں سرسری ملاقاتیں اٹوٹ دوستی کے بندھن میں بندھ جاتی ہیں۔ تاہم آثار بتاتے تھے کہ ہم زیادہ عرصہ اس عبوری دور میں گرفتار نہ رہ سکیں گے۔ کیونکہ باقی جی خطرناک حد تک میرے ہم خیال تھے۔ ادب سے لیکر سیاست تک ہمارے نظریات کم و بیش ایک جیسے تھے۔ اور یہی خطرناک ہم خیالی، ہمیں نظریاتی سطح پر ایک کر گئی۔

ان دنوں میں نے سیاست میں نیا نیا حصّہ لینا شروع کیا تھا۔ اور میرا رجحان چونکہ بائیں بازو کی طرف تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس وقت کی واحد بائیں بازو کی پارٹی، "نیشنل عوامی پارٹی" میں شامل ہو گیا، باقی جی گو کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہ تھے۔ تاہم وہ کالج میں یونین سازی اور اسی قسم کی دوسری سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتے تھے ــــ پاک بھارت جنگ کے بعد جب "اعلان تاشقند" کا سوال اٹھا، تو نیشنل عوامی پارٹی دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اگرچہ تضادات پہلے سے موجود تھے، جو خاصی سنجیدہ صورت اختیار کر گئے تھے۔ تاہم "اعلان تاشقند" اور بین الاقوامی سطح پر چین اور روس کی چپقلش نے بنیاد کا کام کیا اور پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔

ان دنوں ہم نئے نئے سیاسی کارکن، رومانیت کی حد تک بائیں بازو اور اس کی سیاسی پارٹی کے قیام کے خواہاں تھے۔ چنانچہ اس ٹوٹ پھوٹ سے کم از کم میں شدید دل برداشتہ ہُوا اور سب کچھ چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گیا۔ پھر تقریباً ایک برس تک سوائے لکھنے پڑھنے کے کسی طرف توجہ نہ دی۔ اس بے کاری کے زمانہ میں "حلقہ ارباب ذوق" اور ٹی ہاؤس میں متواتر بیٹھنے سے کچھ نئے دوستوں سے تعارف ہُوا، تعارف کروانے والوں میں باقی جی پیش پیش تھے۔ پھر میں اور باقی جی ایک ساتھ سیاسی میدان میں کُودے اور اُسی زمانے میں اس دوستی کی بنیادیں پڑیں جو آج تک قائم ہیں۔

وہ دور ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میرے لیے اس طرح کہ اُسی دور میں میں نے سنجیدگی سے اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل طے کیا اور باقی جی کے لئے یوں کہ اُسی دور میں باقی جی نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اپنی پہلی غزل کہی، جو اسلامیہ کالج کے مجلّہ "فاران" میں طبع بھی ہوئی۔ جس کا مطلع ہے ؎

برف سے اٹھتے ہوئے شعلوں نے دی ہم کو خبر
پھر کوئی سورج اٹھا اور پھر کہیں ابھری سحر

اُس دور میں باقی جی عملی سیاست میں بہت گہرے اتر گئے تھے۔ دن رات سیاسی کام نے انہیں عملی طور پر

وہ طبقاتی بُعد دکھایا، جس کو وہ محض کتابوں سے پڑھ کر سمجھے تھے، مظلوم طبقوں کی حالت زار باقی جی جیسے حساس نوجوان کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوئی اور انہیں اپنے فلسفۂ حیات پر پہلے سے زیادہ یقین اور ادراک حاصل ہُوا۔ چنانچہ ان کی ابتدائی شاعری میں ہی اس ظلم اور جبر اور اس کے خلاف سینہ سپر ہونے کی آرزو جھلکتی نظر آتی ہے ؎

دُھند کے پیچھے چھپی ہر چیز واضح ہو گئی
جبر کے بڑھتے ہوئے احساس کا کچھ ہے اثر
دیکھ لو تم بھی تماشا رات کی تاریکیو!
آگ کی لہروں میں آکر بہہ چلا ظلمت نگر

باقی جی پر شاعری کا خروج ایک دم نہیں ہُوا، ابتداء میں تو محض ایک آدھ غزل ہی ہوا کرتی تھی۔ جسے وہ اپنے دوستوں کے گوش گذار کر کے جیسے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جایا کرتے تھے۔ شروع میں تو وہ بھی خود کو شاعر نہیں کہتے تھے۔ مگر پے در پے پھر غزلیں ہونے لگیں تو انہوں نے بھی سنجیدگی سے اس طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ پڑتی پھوار کی طرح وہ اشعار کے ترنم میں ڈوبتے چلے گئے۔ ویسے بھی عام شاعروں کی طرح انہوں نے کبھی خود پر جبر کر کے شاعری نہیں کی۔ بلکہ شعر اس وقت کہا، جب خیالات نے لفظوں میں اور لفظوں نے شعر کے قالب میں ڈھلنے کے لئے انہیں مجبور اور انگیخت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی دور کی شاعری خاصی مختصر ہے۔ کبھی کبھار کوئی واقعہ، کوئی جذبہ یا کوئی سانحہ انہیں مجبُور کرتا تو وہ شعر کہدیتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک دن پڑھانے کے بعد (ان دنوں ہم نے ایک ٹیوشن سنٹر قائم کر رکھا تھا) ہم فارغ ہوئے تو یک لخت اُن پر ایک شعر کا نزول ہُوا، شعر یوں تھا ؎

کھُرتے جال میں میرا اپنا لہو، زندگانی کے ریشوں سے کٹتا گیا
سوزِ احساس نے جب جگایا مجھے، زرد چہرے کا ہالہ سمٹتا گیا

انہوں نے شعر چاک سے بلیک بورڈ پر لکھ دیا۔ میں نے کافی زور دیا کہ غزل پوری ہو جائے، مگر باوجود کوشش کے غزل آگے نہ چل سکی۔ آمد مکمل طور پر بند ہو گئی تھی۔ پھر یہ غزل بہت عرصے بعد ۶۸ء میں مکمل ہوئی۔ شاید ۶۸ء کی آمریت دشمن تحریک نے ان کے ذہن کو مواد بہم پہنچایا تھا۔

باقی جی عموماً رات کو شاعری کرنے کے عادی ہیں۔ کسی ویران پارک کے چپ چاپ گوشے میں یا موسیقی سنتے ہوئے ان پر شعر اترنے لگتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ طبیعت موزوں نہیں ہوئی اور تمام رات آوارہ

گردی میں گذر گئی، لیکن ایک شعر بھی نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ رات بھیگنے سے پہلے ہی غزل مکمل ہو گئی ہے۔ اور دوسری غزل کے اشعار اترنے شروع ہو گئے ہیں۔ کسی کسی رات تو دو غزلیں ایک نظم اور ایک آدھ گیت لے کر وہ واپس گھر لوٹے ہیں۔ مگر ایسا موقع شاذ ہی نصیب ہوا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، بانی جی کی ابتدائی شاعری ایک تو بہت کم تعداد میں ہے۔ دُوسرے ان کی لاابالی طبیعت نے غزلوں اور نظموں کو سنبھالنے کے سلسلے میں انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ جس کی وجہ سے اُن کی ابتدا کی تقریباً تمام تخلیقات ضائع ہو گئیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانے میں وُہ خود کو شاعر مانتے ہی نہ تھے بہر حال ایک آدھ غزل یا نظم ہی آج ملتی ہے۔ جنہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی شاعر میں شدت احساس اپنی تمام تر جدّت اور ندرت کے ساتھ موجود تھا۔ اس دور کی نظم "لمحوں کا دُکھ" اس کی شاہد ہے ؎

ایک لمحہ،
کئی صدیوں میں بکھر جاتا ہے،
جب کبھی گذری ہوئی کل کا خیال آتا ہے،
کل!
کہ دامن میں چھپائے ہوئے مُردہ لمحے،
وقت کی قبر میں دفنا کے جنہیں بھول گئی
برف کے کوہ بنے اُبھرے ہیں۔
آج کے سینے پہ ہیں،
مرتے ہوئے چاند کی لاکھوں کرنیں،
یاس و امید کے سنگم پہ کھڑی سوچتی ہیں،
صبح کی پہلی کرن
ان کا جنازہ ہو گی!!

بانی جی کی کم و بیش تمام شاعری، سیاسی صورتِ حال کے ساتھ اس طرح پیوست ہے کہ دونوں کو ایک دُوسرے سے جدا کر کے دیکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ "لمحوں کا دُکھ" بانی جی نے اس وقت لکھی تھی، جبکہ ایوبی آمریت کا دم گھونٹنے والا جمود آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا تھا۔ اور ایک تحریک کے ابھرنے کی علامتیں ظاہر ہونا

شروع ہو گئی تھیں۔ لوگ یاس و امید کے سنگم پر کھڑے تھے۔ صرف ایک پتھر کی ضرورت تھی، جو اس ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل مچا سکے۔ پھر جب آمریت دشمن تحریک کا سیل رواں امڈا تو بالی جی نے نہ صرف اس میں عملی طور پر حصّہ لیا۔ بلکہ اپنے اشعار میں بھی جا بجا اس کا واضح اظہار کیا ؎

برف کے شہر پر اتنے سورج گرے، کُو بہ کُو پھیل کر لوگ طوفاں بنے
دیکھ کر یہ سماں، ظلم کا ہر نشاں، اپنے مآخذ کی جانب پلٹتا گیا
ظلمتوں کا نگر، فاصلوں کی ڈگر، ہر طرف، ہر جہت حسرتوں کا زہر
پی کے اس زہر کو، عصر کے قہر کو، بانجھ نسلوں کا سینہ بھی پھٹتا گیا

پھر پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نیا موڑ آیا۔ ایوب دشمن تحریک کے دوران ہی "پاکستان پیپلز پارٹی" ایک طاقتور سیاسی قوت بن کر ابھری، بائیں بازو کے دوسرے لوگوں کی طرح بالی جی نے بھی طبقاتی شعور دینے کے کام کا آغاز کر دیا وہ دور بڑی ہنگامہ آرائی کا دور تھا۔ جلسے، جلوس، لاٹھی چارج، مظلوم عوام پاکستان بھر میں سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ جگہ جگہ دفتر کھل رہے تھے، دفتر بند ہو رہے تھے۔ بالی جی بھی اپنے حصّہ کا کام کرنے میں منہمک تھے۔

مگر اسی دور میں چند ایک ایسے حادثات رونما ہوئے، جنہوں نے نہ صرف بالی جی کی زندگی، بلکہ انکی شاعری پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اور انہیں واقعات کی بدولت بالی جی کی سیاسی وفاداریاں مشکوک ہو گئیں۔ جن ساتھیوں کے ساتھ بالی جی دن رات مزدوروں اور طالب علموں میں سیاسی کام کرتے رہے تھے۔ اُن سے ایک دم قطع تعلق سا ہو گیا۔ دونوں طرف سے اشتعال انگیز باتیں ہوئیں۔ اور بالی جی یک لخت اس بھرے شہر میں اچھوت قرار دے دیئے گئے، شاید بالی جی کی زندگی میں یہ پہلا بڑا حادثہ تھا۔ جس نے انہیں اپنے ہی لوگوں میں اجنبی اور بے گانہ بنا دیا۔ وہ کافی عرصے تک تنہا ہی سیاسی میدان میں اپنی آبلہ پائی کا نظارہ کرتے رہے۔ ان کا دوستی اور دوسرا تھ کے لفظوں پر سے ایمان اٹھ گیا۔ اور وہ تیزی سے موضوعیت پسندی کی طرف چل پڑے۔ اس مقام سے بالی جی کی شاعری کا وہ دور شروع ہوا۔ جس کی زیادہ تر غزلیں، داخلیت پسندی کی مظہر ہیں۔ جس میں شاعر خود اپنی ہی ذات سے مخاطب ہے اور اپنی ہی سوچوں کی ٹوٹی ہوئی بے ترتیب کرچیوں کو نئے سرے سے جوڑنے میں محو نظر آتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

اداس لمحوں کا ہمسفر ہوں — خود اپنی ہستی سے بے خبر ہوں
مقام عبرت نہ بن سکی جو — شکستہ نسلوں کی وہ خبر ہوں

(۱۷۱)

آبادی میں بکھرے ہوئے ویرانوں کا گھر ہوں — خود اپنی ہی الجھی ہوئی سوچوں کا اثر ہوں
دیکھا نہیں صدیوں سے کوئی بھٹکا مسافر — ابلاغ کو جاتی ہوئی اک راہ گذر ہوں
جو اپنے اندھیروں سے نہ نکلے کبھی باہر — وہ برف میں ڈوبے ہوئے سورج کی سحر ہوں

(اوراق)

لوگ تو نفرت کے سورج کی شعاع سے جل گئے — میرا دل تھا جو محبت کا بھی تیشہ سہہ گیا

اس پورے عرصے میں شاعر کی ذات پر ایک اضمحلال طاری نظر آتا ہے۔ اور اسے اپنی تمام جدوجہد لاحاصل اور بے کار نظر آتی ہے اُسے اپنی آرزوئیں، اپنی تمنائیں، اپنے خواب محض سراب نظر آنے لگتے ہیں، جس کا اظہار کچھ یوں ہوتا ہے ؎

حسرتوں سے بھی کھیل دیکھا ہے — ہم نے یہ دُکھ بھی جھیل دیکھا ہے
آرزو کے سراب میں ہم نے — درد بیڑوں کو ٹھیل دیکھا ہے
ہیں خلا ہی خلا مقدر میں — ہم نے سوچوں کو بیل دیکھا ہے — وغیرہ وغیرہ

تاہم اس زمانے میں ان داخلی اور گھٹی ہوئی تشنہ سوچوں نے ان کے سیاسی عمل کو نقصان نہ پہنچایا تھا۔ وہ حسب سابق "پیپلز پارٹی" میں سیاسی کام کرتے رہے۔ مایوسیاں تھیں، تنہائیاں تھیں، مگر پھر بھی وہ اس قدر مایوس نہ ہوئے تھے کہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے۔ اپنی تمام تر داخلیت اور لاصلیت کے باوجود اُس زمانے میں باقی جی کی شاعری میں امید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ کتنی دھندلی اور کمزور کیوں نہ ہوں۔ جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ عمل، زندگی اور اس کی رنگا رنگی سے ابھی مایوس نہیں ہوئے، یاس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں، حسرت آمیز ہی سہی مگر زندگی سے پیار کا احساس ہوتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

گرچہ خوشیاں ہیں ہم سے دُور ابھی — ان سے ہوگا کبھی تو سنگم بھی
کب تلک اور ہم ترستے رہیں — آ بھی جاؤ ہے جانے کو دم بھی

(اوراق)

سانس سانس آگ ہو، اب یہی ہے آرزو — میں قفس قفس اجاڑ برف سے نکل گیا

(اوراق)

درد کے اندھے پنگھٹ پر جب جیون راہ ٹوٹے — شعلوں کے جھرمٹ میں اترا، ناشادی کیوں چاہے گا
موت کی دیوی جی لے تو بھی بس اب چار گھڑی — خوف کے مندر میں مرجھایا مستعدی کیوں چاہے گا

ظلم کی رات تھی جہل کے روپ میں فرض اپنا بھی لیکن ادا ہو گیا وغیرہ وغیرہ

اور یہی احساسِ فرض اور نظریئے کی کشش تھی کہ باقی جی تنہا سہی، مگر میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ مگر جب پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت میں الیکشن کی طرف رجحان نظر آیا، اور بالآخر ہالہ کانفرنس میں الیکشن کے حق میں ووٹ دے دیا گیا۔ جس کی بنا پر آمریت دشمن تمام عوامی اخبار "پرچی" کی نظر ہو گیا۔ تو دوسرے مخلص کارکنوں کی طرح باقی جی بھی بد دل ہوئے۔ یہ بات درست ہے کہ باقی جی کو پیپلز پارٹی کے طبقاتی کردار سے مکمل واقفیت تھی اور وہ اس قسم کے نام نہاد جمہوری اقدام سے بھی بے خبر نہ تھے تاہم یہ ناکامی اور احساسِ شکست، ان داخلی الجھنوں اور تشنہ سوچوں کو ابھارنے اور سطح پر لانے کے لئے بنیاد بنا اور باقی جی پر یک لخت مایوسی کے تاریک بادل یلغار کر آئے۔

پرانے دوستوں سے کٹ کر اور اس بے رحم داخلیت سے گبھرا کر باقی جی نے نئے دوستوں کے ساتھ کام کرنا قبول کیا اور نئے سرے سے سنبھالا لیتے ہوئے طالب علموں میں مصروف ہو گئے، مگر بنگلہ دیش کا مسئلہ یہاں بھی اختلاف کا روپ دھار گیا۔ اور یہ سیاسی اختلاف بالآخر باقی جی کی دوستوں سے قطع تعلقی پر منتج ہوا،

ہمارے ہاں دراصل بدقسمتی سے سیاسی اختلاف، ذاتی اختلاف کا روپ دھار لیتا ہے۔ جس سے بجائے فائدہ کے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ چنانچہ اس علیحدگی نے باقی جی کو سخت بے چین کیا اور وہ ذات کی ان تاریک گپھاؤں میں اتر گئے، جہاں اداسی، محرومی اور کرب کے زہریلے دھوئیں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہیں سے ان کی شاعری میں خود اذیتی اور قنوطی ذریعہ اظہار راہ پاتا ہے۔ جس نے بڑھ کر باقی جی کی تخلیقی قوتوں کو نرغے میں لے لیا اور ان پر لاحاصلیت کا رنگ مزید گہرا اور گھنا ہو گیا۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

دیکھ کتنا لرزاں منظر ہے ٹوٹتے پاؤں سامنے گھر ہے

کون پوجا کے پھول لائیگا زندگی اک اجاڑ مندر ہے

غم کی دہلیز پر ہوئے چھلنی یہ نہ جانا کہ کانچ کا در ہے

سلگتی سانسوں کی آنچ لے کر خوشی کی راہوں پہ چشم تر ہوں

چلو بھلا دو میرا فسانہ کہ بیتے کل کا گیا پہر ہوں

چاندنی بانٹتا، چاند بھی تھک گیا — میرے آنگن میں پھر بھی اندھیرا رہا
ایک بھی آنکھ جگ میں نہ پرنم ہوئی — اتنی عظمت سے میرا جنازہ اٹھا

گھر کے دروازے اجنبی سے لگیں — اپنی پہچان کھو گئے ہم بھی
کون کھائے فریب صبحوں کے — آج اندھے ہوتے ہیں انجم بھی

اجڑے ہوئے سینے میں بھی ارمان تھا کبھی — صحرا میں ڈھل گیا ہے جو طوفان تھا کبھی
محرومیوں کے تیر چلاؤ گے اب کہاں؟ — پتھرا گیا وہ شخص جو انسان تھا کبھی
خود چیخ بن گیا ہے جو اپنے وجود کی — تیرے گلاب ہونٹوں کی مسکان تھا کبھی

وغیرہ وغیرہ

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ جہاں داخلیت اپنے پاؤں جما تی ہے۔ وہاں سے عقل و خرد رخصت ہو جا تی ہے اور محض جذبا تیت کا دور دورہ نظر آنے لگتا ہے۔ اور یہ بھی داخلیت ہی ہے جو اپنی انتہائی صورت میں ابلاغ کو مسخ کر دیتی ہے اور ذریعہ اظہار میں ابہام اور ایمائیت کا رنگ بھرتی ہے۔ مغربی شاعری میں ملارمے اور بادلیئر اس کی واضح اور اہم مثالیں ہیں، "شگوفہائے شر" میں بادلیئر کی قنوطیت مریضانہ حد تک پہنچ گئی ہے اور ملارمے میں یہی داخلیت ذریعہ اظہار کو اس قدر پیچیدہ اور مبہم کر دیتی ہے کہ بعض اوقات قاری سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ مگر شاعر جو کہنا چاہتا ہے اس تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ اردو شاعری میں میراجی اسی جذباتیت اور قنوطیت کے علم بردار ہیں۔ ان میں بھی داخلیت ابہام اور ایمائیت کے ایسے رنگ دکھاتی ہے کہ پڑھنے والا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے، اور ہزار کوشش کے بھی کچھ پلے نہیں پڑتا۔ بالی جی کی داخلیت ذرا مختلف قسم کی ہے۔ وہ اتنی پیچیدہ مبہم اور دوراز کار نہیں ہے کہ مفہوم خبط ہو کر رہ جائے تاہم ان کے ہاں بھی داخلیت کے آتے ہی عقل و خرد رخصت ہو گئی۔ اور ان کی جگہ محض جذباتیت نے لے لی۔ جس کی بنا پر اشیاء اور ان کے مظاہر دھندلے دھندلے اور ناقابلِ فہم ہو کر رہ گئے۔ مثال کے طور پر "پیپلز پارٹی" کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے ان کا رویہ پارٹی کے معاملے میں سائنٹفک تجزیے سے زیادہ جذباتی ہو گیا ہے، دوسری طرف وہ بائیں بازو کے عدم اتحاد سے نالاں ہیں۔ لیکن اس توڑ پھوڑ کے حقیقی اسباب کی نشان دہی کرنے کی بجائے، محض جذباتی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور ان تلخ حقائق کو اسباب

کی حقیقی روشنی میں رکھ کر پرکھنے کی بجائے، صرف اپنی ذات کے حوالے سے انہیں بیان کر دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے۔

دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا
شمس اندھا ہوا دن سیاہ ہو گیا
ہم اندھیروں میں اب بھی بھٹکتے ہیں کیوں
صبح کا تارا تو کب کا فناہ ہو گیا

اور

میں نے کب کہا سجن رات غم کی کٹ گئی
آ کے میرے دوار سے روشنی پلٹ گئی
کیا کہوں میں ساتھیا! رائیگاں کی دھوپ جو
ڈس کے میری خواہشیں کرچیوں میں بٹ گئی

اور

نویدِ صبح کی بشارت کچھ اس طرح سے ملی
ستم کی آنچ پہ ہر فرد تھا پگھلتا ہوا
جنوں کی راہ میں ہم تو تھکے نہیں تھے مگر
کسے کہیں کہ رکا وقت ساتھ چلتا ہوا

اور

کچھ اس طرح کا ہم کو تماشا دکھا گیا
شعلوں کو کوئی برف کا پیکر بنا گیا
ہم کھوکھلے سے لوگوں سے جا کر کہیں تو کیا
خالی تھا وہ بھی شخص جو محفل پہ چھا گیا

اور

عصر کے زہر میں نہائی ہے
ویسے کہنے کو صبح آئی ہے
کاٹ کر سر بنا لیا کاسہ
پھر بھی مرنے کی بھیک پائی ہے

وغیرہ وغیرہ

اک طائرانہ نظر ہی ڈالیں، تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ بالی جی کی شاعری کا یہ درمیانی دور (اسے عبوری دور بھی قرار دیا جا سکتا ہے) خارجیت سے داخلیت تک کا پُرخطر سفر ہے۔ اس سفر میں ان کے ہاں امید سے زیادہ مایوسی اور سرخوشی کے احساس سے زیادہ کرب کا رنگ غالب ہے۔

اسی دور میں جب بالی جی خود کو راہِ وفا کا تنہا مسافر سمجھ رہے تھے ایک اور دلخراش حادثے نے انہیں حواس باختہ کر دیا۔ یہ حادثہ ان کی والدہ کی ناگہانی موت کی صورت میں وقوع پذیر ہوا اور یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ بالی جی

جیسے حساس شاعر کے لئے، جسے زندگی پہلے ہی کافی زخمی کر چکی تھی۔ والدہ کا یوں یک لخت چھن جانا، آخری سہارے کا چھن جانا تھا۔ سرد مہریٔ ارباب وطن سے نڈھال باگی جی کو صرف یہی ہستی بار بار احساس دلایا کرتی تھی کہ وہ اب بھی کم از کم ایک شخصیت کی نظروں میں محترم ہیں۔ کسی ایک فرد کو اب بھی ان کا انتظار رہتا ہے اور زندگی کو اب بھی ان کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درمیانے دور کی ابتدائی شاعری میں جہاں مایوسی اور تنہائی کا زہریلا احساس انہیں بے چین رکھتا تھا۔ وہ زندگی سے مایوس نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے ٹوٹ کر کبھی موت کی خواہش نہ کی تھی۔ بلکہ انتہائی مایوس غزلوں میں بھی ایک آدھ شعر اچھے دنوں کی آمد کا مژدۂ جانفزا سناتا نظر پڑ جاتا تھا۔ جن دنوں ان کی والدہ بیمار تھیں۔ وہ امید اور ناامیدی کے سنگم پر کھڑے نظر آتے تھے۔ کبھی خاصے رجائی اشعار کہنے لگتے تھے اور کبھی انتہائی قنوطی غزلیں کہہ دیتے تھے۔

اُن دنوں انہیں صرف ایک " PUSH " کی ضرورت تھی، جو انہیں واپس ہنستی کھیلتی زندگی اور اس کی رنگارنگی کی طرف بھی لا سکتی تھی۔ اور انہیں مایوسی کی اتھاہ تاریکیوں میں بھی دھکیل سکتی تھی۔ والدہ کی ناگہانی موت اور خارجی دنیا کی ابتر حالت نے " PUSH " کا کام تو کیا مگر منفی انداز میں اور وہ تنہائی، تاریکی اور دم گھونٹ دینے والی لاحاصلیت کے غاروں میں گر گئے۔ اس دور میں پہلی مرتبہ انہوں نے خلوص دل سے موت کی خواہش کی، اس زمانے کی شاعری میں ایک ایسے تنہا شخص کی دلخراش چیخیں صاف سنائی دیتی ہیں، جسے تاریکی اور کرب کی پیچ در پیچ راہوں سے باہر نکلنے کا راستہ سجھائی نہیں دیتا اور وہ وہیں تنہائی کے زہر میں بھیگا کراہ رہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہر طرف چیختے ہیں سناٹے ۔۔۔ شہر یہ ہم نے بسائے یارو
گھر کے آنگن سے اندھیرا نہ گیا ۔۔۔ داغ دل کے بھی جلائے یارو
زندگی کن کا مقدر ہوگی ۔۔۔ ہم پہ تو موت کے سائے یارو

حسرتوں کا مزار مت پوچھو ۔۔۔ اجڑے لوگوں کا کوئی شہر نہیں
زندگی نے ہمیں سکھایا یہی ۔۔۔ غم کے آنے کا کوئی پہر نہیں

ملنے کا پتہ
مکتبہ علم وادب کچہری روڈ لاہور

حسرتو! اس بدن کی بستی میں — تم رہو میں ہی نکل جاؤں گا
مجھ کو شعلوں میں پڑا رہنے دو — برف کا در ہوں پگھل جاؤں گا
کون سانسوں کا قفس چاہے گا — میں تو بپھرا کے بہل جاؤں گا

کیا کہیں سانسوں کا اپنی مدعا — ڈھونڈتے ہیں زندگی کا راستہ
ہونٹ میرے اک ہنسی کی آرزو — آنکھ اجڑے منظروں سے آشنا
اپنی سوچوں کی حقیقت کیا کہیں — دل میں ریزہ ریزہ کوئی خواب تھا

مسکراہٹوں کا رنگ اس قدر مچل گیا — میں پلک پلک تلک آنسوؤں میں ڈھل گیا
آج کیوں صدائیں دوں رحم کے خداؤں کو — میرا اعتقاد تو حرف حرف پگھل گیا

چھا گئی زیست پہ کچھ ایسی ہی شام — کرچیاں ہو کے لہو بنتا گیا ہاتھ میں جام
راکھ ہو کر ہی بجھ جائیں فضائیں یارو! — شہر پر شور میں قبروں کا نہیں کوئی مقام

وغیرہ وغیرہ

باقی جی کی شاعری کا درمیانی دور صوفیانہ استغراق کا دور ہے۔ اس دور میں وہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ایک بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستے پر ڈولتے، لہرتے، بکھرتے اور سمٹتے بڑھتے رہے۔ اس قسم کی از خود رفتگی میں خارج سے محض برائے نام تعلق رہ جاتا ہے۔ تمام رشتے، تمام بندھن، توہمات معلوم ہوتے ہیں۔ ہر چیز کا مفہوم صرف اور صرف داخلی واردات کے حوالے سے تشکیل پاتا ہے۔ اور اشیاء فی الذاتہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں بلکہ محض پرچھائیاں بن جاتی ہیں۔ اور انسان پر ایک مجہول سی بے حسی غلبہ پا لیتی ہے۔

یہی بے حسی اس دور میں باقی جی پر بھی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ انہوں نے سیاسی کام ترک کر دیا تھا۔ وسیع حلقۂ احباب سمٹ کر چند قریبی دوستوں تک محدود ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اپنی ذات میں یک و تنہا تھے صبح حسب معمول گھر سے نکلتے اور تمام دن جلتا سورج انہیں مختلف کالجوں، پارکوں اور ہوٹلوں میں سایہ سایہ بھٹکتا دیکھتا اور تھک کر

مغرب میں منہ چھپا لیتا۔ شام اتر آتی، راستے دھندلا جاتے، مگر باقی جی گھر کو لوٹنے والے راستے سے کترا کر ان راہوں پر ہو لیتے، جو آباد شہر کے ویرانوں کی طرف جاتی تھیں۔

پھر ایک ایک کر کے روشنیاں بجھ جاتیں، ہنگامے دم توڑ جاتے، رات بھیگ جاتی اور رات کے پچھلے پہر کی تیز ہوا اونچی اونچی بلڈنگوں پر اوپر ہی اوپر چنگھاڑنے لگتی۔ اس وقت باقی جی شہر کے کسی تاریک اور ویران کونے سے برآمد ہوتے، پھر لڑکھڑاتے، ڈولتے، گرتے پڑتے، خراماں خراماں گھر کی طرف چل دیتے، تازہ غزل کے زخمی اشعار اُن کے ہونٹوں پر پھڑپھڑاتے اور اس طرح سنسان سڑکیں انہیں گھر تک چھوڑ کر پلٹ جاتیں۔

یہ دور باقی کی شاعری میں تاریک ترین دور ہے۔ اس دور میں انہیں ہر طرف دکھ، اداسی اور بے حسی کے عفریت نظر آتے ہیں۔ تنہائی اور داخلی بے چینی نے ان پر ایک مجذوبانہ علیحدگی پسندی طاری کر دی تھی۔ جس کے حوالے سے وہ جمود اور چپ کی شاعری کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ آخری سہارا یعنی نظریاتی وابستگی بھی دم توڑ گئی تھی۔ اور اچھے دنوں کی خواہش اور صبح کی روشنی بھی بے معنی نظر آنے لگی تھی۔ جسکا اظہار ان کے اشعار میں کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

کیا ملے گا ہمیں سویروں میں — روشنی کھو گئی اندھیروں میں
گھر کو لٹوا کے یہ سنا۔ یارو! — ہم بھی شامل رہے لٹیروں میں
زندگی کے نگر میں آئے کون — خاک اڑتی ہے یاں بسیروں میں

اور

زندگی ہی میں مر گئے ہم لوگ — کیا کہیں خود سے ڈر گئے، ہم لوگ
درد کی آڑی ترچھی راہوں میں — ایسے سمٹے، بکھر گئے، ہم لوگ
ڈھونڈنے پر نشان بھی نہ ملا — آج ہی اپنے گھر گئے، ہم لوگ

اور

جیون دکھ پر بانجھ رُتوں کی برساتیں — ہم نے دیکھیں ظالم صبح کی برکاتیں
لوگ دیوانے نعروں میں آباد ہوئے — بھول گئے غم کی کالی گہری راتیں

اور

برف کا شہر اور میری چُپ — آس کی لہر میں گھنیری چپ
بات کرنی کسے نہیں آتی — لُوٹ کر لے گئی اندھیری چپ
سامنے آئے موت میں اترے — آج کے پہر میں دلیری چپ

ان دنوں جب باقی جی اس قسم کی یاس انگیز شاعری کر رہے تھے۔ چند دوستوں نے مل کر "الصوفیا" قائم کی اور باقی جی کو دعوت دی کہ وہ وہاں اپنی تخلیقات پڑھا کریں۔ اُس زمانے میں باقی جی اپنی موضوعی شاعری کے نقطۂ عروج پر تھے۔ چنانچہ باقی جی نے "الصوفیا" میں جو پہلی غزل پڑھی وہ موضوعی کرب اور مایوسی کا شاہکار تھی، اس غزل کے صرف دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

ذہن ہی جب بن چکے ہوں بانجھ کھیت ـــــ فصل لاشوں کی جو بوئیں بھی تو کیا
آب میں ڈھل جائے ہر شے جس جگہ ـــــ ہم قلم خوں میں ڈبوئیں بھی تو کیا

ساتھیوں نے خلوص نیت اور ہمدردانہ تنقید کی، کئی مقام پر باقی جی اور "الصوفیا" کے دوستوں میں اتفاق رائے ہو گیا۔ باقی جی بھی اس تنقید سے مطمئن ہوئے اور انہیں خوشی ہوئی کہ ان کی تخلیقات کو صحت مند تنقیدی نقطۂ نظر سے پرکھا جاتا ہے۔

پھر باقی جی زیادہ عرصہ یاس انگیز شاعری نہ کر سکے اور اپنے دوست نما دشمنوں کی توقعات کے برعکس انہوں نے اک نیا سنبھالا لیا اور دوبارہ زندگی اور اس کی رنگا رنگی کی طرف لوٹنے لگے، اس میں "الصوفیا" کے دوستوں کا بھی نمایاں ہاتھ ہے۔ جو گروہ بندی سے بلند ہو کر صحت مند بنیادوں پر تنقید کرتے تھے اور باقی جی کی نظریاتی کمزوریوں اور داخلی الجھنوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ یہیں سے باقی جی کی شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں وہ مریضانہ داخلیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اس دور کا آغاز اس غزل سے ہوا۔

ستم کے نگر میں کرا دو منادی ـــــ کہ ہم نے چورا ہے میں تربت سجا دی
ہمیں صبر کے راستوں پہ نہ ڈالو ـــــ کہ ہم نے مقدر کی بستی اٹھا دی
کہو موت کی شام سے آج نکلے ـــــ کہ ہم نے صلیبوں پہ ہستی لٹا دی
ذرا سوچ کر ہم سے آنکھیں ملانا ـــــ کہ ہم نے مروّت کی عادت بھلا دی

یہ غزل دراصل باقی جی کی شاعری کے نئے دور کا اعلان نامہ تھا۔ اس میں پہلی بار اس اعتماد کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو باقی جی کی عملی زندگی کا طرّہ امتیاز رہا ہے۔ جو درمیانہ دور کی شاعری میں مفقود نظر آتا ہے۔ اپنی ذات پر دوبارہ اعتماد بحال ہو جانے سے باقی جی میں ایک نئی تازگی، ایک نیا ولولہ ابھرتا محسوس ہوتا ہے اور وہ تیزی سے تنہائی اور یاسیت کے اندھے کنوئیں سے نکلتے نظر آتے ہیں، تا کہ صاف اور شفاف ہوا سے اپنے پھیپھڑوں کو بھر سکیں۔ "الصوفیا" کے ساتھیوں نے ان کی مایوسی، احساسِ شکست اور لاحاصلیت کی نہ صرف

نشاندہی کی تھی بلکہ عملی طور پر دوسرا تھ ، دوستی اور نظریاتی بندھنوں کو ان میں نئے سرے سے روشناس کرایا تھا۔ اور اہنیں اجتماعی احساس سے بہرہ ور کیا تھا۔ چنانچہ اس نئے دور میں (جو ابھی تک جاری ہے) ان کی تخلیقات پر یاسیت کا رنگ ہلکا پڑنے لگا ، اور زندگی کے جملہ مسائل سے مردانہ وار نپٹنے کا کھویا ہوُا۔ احساس دوبارہ جاگنے لگا۔

اس دور کو ہم بالی جی کا داخلیت سے خارجیّت کی طرف مراجعت کا دور کہہ سکتے ہیں۔ جس میں انہوں نے موضوع اور معروض کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کا آغاز کیا ہے اور تیزی سے اُس پر قادر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس دور میں انہوں نے نہ صرف فنی اعتبار سے زیادہ پختہ شاعری کی ہے ، بلکہ انقلاب اور تبدیلی پر ان کے ٹوٹے ہوئے یقین کو بھی سہارا ملا ہے۔ جذبے کی شدت ، تراکیب کا تنوّع اور جدّت جو بالی جی کی شاعری کا طرہُ امتیاز ہے۔ اس دور میں مزید نکھر کر پختہ اور مضبوط ہوا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

پلکوں کی سنگینیں اٹھاؤ
ظلم خداؤں کو تڑپاؤ
برف کے سینے میں سورج ہو
کچھ ایسا بھی رنگ جماؤ
آزادی زنجیر ہوئی ہے
دار نگر میں دھوم مچاؤ
موت نے سچ کو پھر سے پکارا
بالی جی تم توڑ نبھاؤ

(اور)

آنکھوں میں زراشک کے دیئے گر چہ ہیں روشن
من میں تو میرے آس کا استھان رہا ہے
دم توڑتے صبح کے ستارے نے خبر دی
راتوں کے مقدر میں سویروں کی ہوا ہے

(اور)

برکھا برکھا نظر ایسے مُسکا گئی
شعلہ شعلہ جبیں زندگی پا گئی
پتھروں کے بدن میں دراڑیں پڑیں
چپ کی آنکھوں میں یوں روشنی آ گئی
صبح کی کرنیں سنائیں فسانے نئے
رات سورج کے آنگن میں شرما گئی
خوف نے جال نکتوں کے لاکھوں بُنے
آگہی سب لکیروں کو بکھرا گئی
موج کی آنکھ میں گاڑھ دو برچھیاں
ساحلوں کے نشاں آشتی کھا گئی
بانجھ صدیوں نے ریزہ فصیلیں چنیں
خشک بالی کے مکھ پہ نمی چھا گئی

یہ درست ہے کہ کوئی تبدیلی یک لخت وقوع پذیر نہیں ہوتی، بلکہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا لامتناہی سلسلہ مل کر ایک بڑی اور وقتی طور پر اہم تبدیلی کو وجود میں لاتا ہے۔ بالی جی بھی یک لخت داخلیت سے گزر کر خارجیت میں نہیں آ گئے۔ بلکہ ایک سفر جاری ہے، جس میں خارجی عوامل جیسے "الصوفیا" کے دوستوں کی تنقید اور دوسرا تھ، ملک کی موجودہ ساز گار سیاسی صورتِ حال اور بالی جی کے ذہن میں غیر محسوس تبدیلیاں۔ اس سفر کی شدت میں کبھی مزید تیزی اور کبھی سست روی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اب بھی اُن پر یاسیت کے دورے پڑتے ہیں اور ان کے اشعار میں مایوسی سرایت کر جاتی ہے۔ اور لہجہ دھیما پڑ جاتا ہے۔ تاہم یہ سفر جاری ہے، بالی جی دوبارہ سیاست میں عملی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ جس نے ان میں اجتماعی نقطۂ نظر کو فروغ دیا ہے۔ اب وہ زندگی کے دکھ سُکھ کو تنہا سہنے کی بجائے مل بانٹ کر برداشت کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ملازمت بھی خاصی اہمیّت کی حامل ہے۔ جو ان کے خود پر اعتماد کی بحالی کی طرف اشارہ کرتی ہے

موضوعیت سے معروضیت اور انفرادی دُکھ سے اجتماعی دکھ تک کا سفر اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ جاری ہے اور بالی جی مردانہ وار اُن فاصلوں کو پاٹ رہے ہیں۔ جو ان کی پوری زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھی۔ جوں جوں یہ بُعد کم ہوتا جا رہا ہے۔ بالی جی کی شاعری میں زندگی کی گھن گرج، اس کا جلال و جبروت اور ایک بہتر زندگی کے حصول کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ تازہ ترین غزلوں سے چند اقتباسات دیکھئے

؎ چال حنا کی دھیرے دھیرے اٹھی ہے کاغذ کاغذ شکلوں کو بھڑکائے گی
دیوی سکھ کی دھرتی دھرتی اتری ہے آنسو آنسو، بستی کو مہکائے گی
جنگل جنگل، لرزہ لرزہ کانپے ہے راون، راون سیتا آگ لگائے گی
جیون آشا ہوا ہوا لہرائی ہے موت سمان خداؤں کو دفنائے گی
اگنی رانی ہونٹوں میں مسکائی ہے بالی جی کے من میں آن سمائے گی

کاغذی آنکھ میں شیشے کی کھنک جاگی ہے برف شریان میں شعلوں کی دھنک جاگی ہے
کہر کے زہر میں ڈوبی ہوئی۔ کجرائی ہوئی خون کی نوک سے مدہوش پلک جاگی ہے
سوچ کی لاٹ سے جلتی ہوئی اوہام چتا آج شمشان سے نروان تلک جاگی ہے
آگ لہروں کے تھپیڑوں سے نکھرتی بالی خوف کے جال میں پتھرائی کسک جاگی ہے

اور یہ جاگنے کا عمل باقی جی کے اندر بھی ہو رہا ہے اور بیرونی ماحول میں بھی جاگرتی کی لہر اٹھ رہی ہے۔ اور ہمیں اس لمحے کا انتظار ہے جب یہ دونوں (موضوعی اور معروضی) عمل ہم آہنگ ہو جائیں گے، پھر اردو ادب کے رنگ محل میں ایک ایسا زندۂ جاوید شاعر داخل ہوگا جس کی آب و تاب صدیوں تک نگاہوں کو خیرہ رکھے گی۔ اور تب ہی بغاوت کا وہ عمل بھی ظہور پذیر ہوگا۔ جو ایک بڑی تبدیلی کا موجب ہوگا اور ہماری جنتا سکھ کا سانس لے سکے گی، وہ لمحہ زیادہ دور بھی نہیں، صرف شرط یہ ہے کہ اس راہ پر ثابت قدمی سے چلا جائے، جسکی طرف باقی جی ہمیں لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں باقی جی کے لفظوں پر غور کرنا چاہیے یقین کیجئے پھر منزل دُور نہ ہوگی

لہو سے چنیں زندگی کی عمارت — نہ ہوگی ستم کی کبھی اب عبادت
جواں سر سجادو چو راہے چوراہے — کہ مردہ رگوں سے نہ ہوگی بغاوت
گئے کل کی مٹی ہوا میں اڑا دو — نئی زندگی، نئی صبح سے عبارت

وغیرہ وغیرہ

لخت پاشا

۱۴ر نومبر ۱۹۷۳ء

بیتے لمحے، جلتے دُکھ



دہر کے جال میں میرا اپنا لہو زندگانی کے ریشوں سے کٹتا گیا
سوزِ احساس نے جب جگایا مجھے زرد چہرے کا ہالہ سمٹتا گیا

برف کے شہر پر اتنے سورج گرے کو بہ کو پھیل کر لوگ طوفاں بنے
دیکھ کر یہ سماں ظلم کا ہر نشاں اپنے ماخذ کی جانب پلٹتا گیا

ظلمتوں کا نگر فاصلوں کی ڈگر ہر طرف ہر جہت حسرتوں کا زہر
پی کے اس زہر کو عصر کے قہر کو بانجھ نسلوں کا سینہ بھی پھٹتا گیا

چال کیسی قیامت کی چلنے لگا امن کا دیوتا آگ لگنے لگا
نفرتوں کا جہاں لے کے اپنا دھواں پیار کی رہگذاروں سے ہٹتا گیا

زندگی مرگ کے پیرہن میں رہے دل نہ مانا کہ جینے کی توہین ہے یہ
زیست کرنے کو آتا میں بے چین ہوا موت کے ہر خدا پر جھپٹتا گیا



برف سے اُٹھتے ہوئے شعلوں نے دی ہم کو خبر
پھر کوئی سُورج اُٹھا اور پھر کہیں اُبھری سحر

دُھند کے پیچھے چھُپی ہر چیز واضح ہو گئی
جبر کے بڑھتے ہوئے احساس کا کچھ ہے اثر

ظُلمتوں سے ہار جانا بزدِلوں کا کام ہے
موت کے جادہ سے پلٹی زندگی منہ موڑ کر

ظُلم کے تیرہ بدن پر خوف کی پرچھائیاں
خُون میں ڈُوبا ہوا ہے ساعتوں کا ہر نگر

دیکھ لو تم بھی تماشا رات کی تارِیکیو
آگ کی لہروں میں آ کر بہہ چلا ظلمت نگر



دیکھ کتنا پُراسرار منظر ہے
ٹوٹتے پاؤں سامنے گھر ہے

کون پُوجا کے پھول لائے گا
زندگی اک اُجاڑ مندر ہے

غم کی دہلیز پہ ہوئے چھلنی
یہ نہ جانا کہ کانچ کا در ہے

کوئی آ کر ہمیں پکارے کیوں
کیا کہیں کس جگہ لٹا گھر ہے

اب کسی بات پہ نہیں روتا
اپنے سینے میں بویا پتھر ہے



اُداس لمحوں کا ہمسفر ہُوں
خُود اپنی ہستی سے بے خبر ہُوں

سُلگتے سانسوں کی آنچ لے کر
خوشی کی راہوں پہ چشم تر ہُوں

مقامِ عبرت نہ بن سکی جو
شکستہ نسلوں کی وہ خبر ہُوں

کوئی رُکے کیوں صدائیں سُن کر
اُجاڑ مندر کا بیں گجر ہُوں

چلو بھُلا دو میرا فسانہ
کہ بیتے کل کا گیا پہر ہوں



آبادی میں بکھرے ہوئے ویرانوں کا گھر ہوں
خود اپنی ہی اُلجھی ہوئی سوچوں کا اثر ہوں

دو پل ہی ٹھہرنے کو بھلا آئے کوئی کیوں
تنہائی کے جنگل کا وُہ بے برگ شجر ہوں

دیکھا نہیں صدیوں سے کوئی بھٹکا مسافر
ابلاغ کو جاتی ہوئی اک راہ گزر ہوں

جو اپنے اندھیروں سے نہ نکلے کبھی باہر
وہ برف میں ڈوبے ہوئے سُورج کی سحر ہوں

تم ٹھیک ہی کہتے ہو نہیں دید کے قابل
اُجڑے ہوئے لوگوں کی وفاؤں کا نگر ہوں



میری صورت دیکھ کر حسرت سے کوئی کہہ گیا
بانجھ صدیوں کی نشانی ایک لمحہ رہ گیا

آیا تھا برباد کرنے مجھ کو کتنی شان سے
خود خزاں کا دیوتا بھی میرے غم میں بہہ گیا

لوگ تو نفرت کے سُورج کی شعاع سے جل گئے
میرا دل تھا جو محبّت کا بھی تیشہ سہہ گیا

آ رہے ہیں پُوچھنے وہ میرے ارمانوں کا حال
دِل کا ننھا سا گھروندہ آج ہی کیوں ڈھ گیا

دِل کے ویرانے میں کوئی اجنبی جھونکا نہ تھا
دھڑکنیں یہ کہہ رہی ہیں کوئی آ کر رہ گیا



غم سے ایسے بھی تو کترا تے گئے
اشک آنکھوں ہی میں پتھراتے گئے

پیار میں لگ کے وہ سینے سے میرے
لفظ اِنکار کا دوہراتے گئے

غیر کو چوم لیا نفرت سے
ہم کو اُلفت ہی میں ٹھکراتے گئے

رہ کے طوفان سے ایسے ٹوٹے
ہم کناروں سے بھی ٹکراتے گئے

زندگی اُن کی مقابر میں ڈھلی
لوگ جو موت سے گبھراتے گئے



چاندنی بانٹتا چاند بھی تھک گیا
میرے آنگن میں پھر بھی اندھیرا رہا

اپنی تنہائیوں کا کروں ذِکر کیا
بِن پجاری کے ہوں ایک اُجڑا خدا

موت کی آرزو آرزو ہی رہی
میں نے ہنس ہنس کے ہستی کا دُکھ بھی سہا

ایک بھی آنکھ جگ میں نہ پُرنم ہوئی
اتنی عظمت سے میرا جنازہ اُٹھا

مُجھ کو ساحل کی اک دن تھی آرزو
اب تو طوفاں ہی میرا کنارا ہُوا



غم زدہ ہو گیا ہے اب غم بھی
اے خُوشی! تیری آنکھ میں نم بھی

چارہ گر سے کہو نہ اَب آئے
زخم بن کر ڈسے ہے مرہم بھی

گھر کے دروازے اجنبی سے لگیں
اپنی پہچان کھو گئے ھم بھی

اپنا احساس مر گیا یارو!
سچے لگنے لگے توا ھم بھی

گرچہ خوشیاں ہیں ہم سے دور ابھی
ان سے ہو گا کبھی تو سنگم بھی

کون کھائے فریب صبحوں کے
آج اندھے ہوئے ہیں انجم بھی

کب تلک اور ہم ترستے رہیں
آ بھی جاؤ ہے جانے کو دم بھی



راکھ جو ہم ہُوئے اُڑا دینا
بُجھ تو جلنے کا تم صِلہ دینا

رسمِ پُوجا نہ ہو پُجاری کوئی
دِل کے مندر کو یُوں گرا دینا

تجُھ پہ رُسوائیوں کے داغ بنیں
ہم کو اتنی تو نہ سزا دینا

جل اُٹھے پھر نہ کہیں نام میرا
یاد کی لوح سے مِٹا دینا

ٹُوٹ کر جلتی ہوئی آنکھوں کو
برف کے زہر میں بُجھا دینا

لمحوں کا دُکھ

بالی جی

لوک کلا پبلیکیشنز —— لاہور

احاطہ اسلام دین - لنڈا بازار



میرے سنگ خاک بسر ہو کہ زمانے کو چنو
کوئی تو ریت نبھانے کے فسانے کو چنو

پیار ہوتا ہے فقط ہار تجھے کیا معلوم
فتح پانی ہے تو اونچے سے گھرانے کو چنو

نام پر تیرے بنا گالی ہوا دیوانہ
تم بھی اوروں کی طرح سنگ اٹھانے کو چنو

میں زمانے کی طرح سکھ تمہیں دے سکتا نہیں
درد کے شہر میں بت میرا سجانے کو چنو

تم کو غم ہے کہ اندھیروں کا مسافر ہوں صنم
مجھ کو جگنو کی طرح راہ دکھانے کو چنو

پیار پھولوں کی نہیں سیج ہے کانٹوں کا نگر
خوف لگتا ہے تو تم لوٹ کے جانے کو چنو

میں کہ رسوائی کا عنوان ہوں لے ڈوبوں گا
نام کو میرے سجن جی سے بھلانے کو چنو



مر بھی جائیں اگر تو کیا ہو گا
بیش تَر آپ کا بھلا ہو گا

ہم کو کر کے برہنہ دیکھ چکے
آپ کو بھی تو دیکھنا ہو گا

وہ جو نخوت سے آج لوٹ گیا
مجھ کو حسرت سے ڈھونڈتا ہو گا

ایک دن تجھ پہ وہ بھی آئے گا
جب نہ تو اپنا آشنا ہو گا

دے کے ہم کو فریب ہستی کے
کیا نہ رویا ۔ کبھی خدا ہو گا



یہ کرم بھی وُہ کر گیا ہوتا
جامِ ہستی جو بھر گیا ہوتا

چھوڑ کر زندگی سے اپنے گلے
میں ہی خوُد سے گزُر گیا ہوتا

پا ہی لیتا سسکتے ویرانے
مجُھ میں کوئی اُتر گیا ہوتا

پلتا سینے میں حسرتوں کا دھُوّاں
تو بھی جینے سے ڈر گیا ہوتا

مُسکراتے تیری طرح ہم بھی
کاش احساس مر گیا ہوتا



مبارک حیدر کے نام

وہ جو خود میں ہی مر گیا لوگو
ہم کو دیوانہ کر گیا لوگو

آئینہ بھی تڑپ کے چور ہُوا
اس قدر میں بکھر گیا لوگو

کُہر کے پیرہن میں رہ رہ کر
اپنا اِحساس مر گیا لوگو

مجھ کو پہچان کر کرو گے کیا
خود سے بھی میں گزر گیا لوگو

برف سوچیں ہی میرے ساتھ رہیں
آگ میں میں اُتر گیا لوگو



زخم لہروں کے بھی کھائے یارو
بیچ منجدھار جو آئے یارو

ہر طرف چیختے ہیں سنّاٹے
شہر یہ ہم نے بسائے یارو

جل اُٹھے آنکھ کے بجھتے صحرا
اُس نے جب دِیپ جلائے یارو

گھر کے آنگن سے اندھیرا نہ گیا
داغ دِل کے بھی جلائے یارو

زندگی کِن کا مقدّر ہو گی
ہم پہ تو موت کے سائے یارو



گلی گلی میں پکارے لہو اُبلتا ہُوا
چلا ہے موت کی ٹوہ میں کوئی مچلتا ہوا

بُریدہ شاخ پہ دیکھا گلاب پھلتا ہُوا
خزاں کا دور بھی آیا ہے ہاتھ ملتا ہُوا

نوید صبح کی بشارت کچھ اس طرح سے ملی
ستم کی آنچ پہ ہر فرد تھا پگھلتا ہُوا

میری نظر کی مسیحائی یا حقیقت تھی
مجھے مزار ملا زندگی میں ڈھلتا ہوا

جنوں کی راہ میں ہم تو تھکے نہیں تھے مگر
کسے کہیں کہ رُکا وقت ساتھ چلتا ہُوا



کچھ ہم برہم کچھ برہم غم
اب ساتھ اُٹھیں تو کیسے قدم

آئی تھی پوچھنے حال میرا
ہوئی آنکھ خوشی کی بھی پُرنم

لوگوں سے شکایت کیا معنی
ہوئے اپنی جان کے دشمن ہم

تم کیا بانٹو گے درد میرا
ہیں روز کی باتیں رنج والم

احساس نے ہم کو مار دیا
اب کیسے نبھے سانسوں کا بھرم



غم بھی دھیرے سے مسکرانے لگا
کیا خوشی کا جنازہ جانے لگا

ہم چلے جائیں گے گھڑی بھر کو
تو ابھی سے ستم اٹھانے لگا

درد کا ساز دے کے سینے میں
کوئی کیوں ہم کو آزمانے لگا

ہم ہی بھولے وفا کی راہوں میں
تو عنایات کیوں جتانے لگا

کیا یہی عشق کا تقاضہ تھا
ہم کو شعلوں پہ تو نچانے لگا



وہ جو ویرانیوں کی مورت تھا
چاند کی طرح خوب صورت تھا

ہم ہی رسمِ وفا نبھاتے رہے
پیار تو آپ کا کدورت تھا

میں خوشی کے فسانے کیسے کہوں
تیرا بہروپ غم کی صورت تھا

وہ کھلونا بھی آج ٹوٹ گیا
جو کبھی آپ کی ضرورت تھا

اشک جو آج غم سے پتھرایا
درد کے گاؤں کا مہورت تھا

پبلشرز ________ رفیق راہی
پرنٹرز ________ فرینڈز آرٹ پریس
کتابت ________ رشید احمد آزاد
آرٹسٹ ________ ایچ اے جی ایڈورٹائیزرز
تعداد ________ ایک ہزار

پہلا ایڈیشن



تیری محفل میں یہ کیا کر لائے
خود کو دیوانہ بنا کر لائے

تم پہ الزام نہ بننے کے لئے
دیکھ ہم خود کو مٹا کر لائے

مسکراہٹ کے کفن میں ہم تو
لاش اشکوں کی چھپا کر لائے

تم سے شکوہ ہی نہ کر بیٹھیں کوئی
دیپ آنکھوں کے بجھا کر لائے

راہ میں چھوڑ کے گر جانا تھا
گھر سے کیوں ہم کو بلا کر لائے

آنکھ ہنستی سے رلانے کے لئے
زہر ہم خود کو پلا کر لائے

تو نہیں وہ کہ اُجاڑا جس نے
دل کو ہم اتنا تبا کر لائے



زندگی اتنی ضروری تو نہ تھی
داستاں غم کی ادھوری تو نہ تھی

پاس پہنچے تو گرے نظروں سے
دُور رہ کر بھی یہ دُوری تو نہ تھی

نہ رہے اپنے ہی قابل ہم تو
بات اُن کی بھی یہ پُوری تو نہ تھی

دیکھ کر زیست میں اپنی صُورت
ماتھے پہ موت کے تیوری تو نہ تھی

کون سہتا ہے ستم مرضی سے
چال اپنی بھی شعوری تو نہ تھی



ساتھ چل کر بھی وُہ بیگانے رہے
اپنی قسمت میں تو وِیرانے رہے

چل دیئے وہ تو یہ محسُوس ہُوا
آنکھ میں اُن کے افسانے رہے

لُٹ گیا گھر تو نہ رونا آیا
درد کے نام سے انجانے رہے

جلتے ہونٹوں پہ نمی جاگ اُٹھی
مَے کی چاہت میں جو میخانے رہے

لوگ دِیوانگی میں جیت گئے
ہم ہی پاگل تھے جو فرزانے رہے



تم کسی کا بھی اِنتظار کرو
کون کہتا ہے ہم سے پیار کرو

آ ہی پہنچا ہُوں آج پاس تیرے
مجُھ کو میری نظر میں خوار کرو

میری باتیں دغا فریب سہی
اپنی باتوں پہ اعتبار کرو

ساتھ چلنا تمھُیں گوارا نہیں
ٹوٹ جانے پہ اِنحصار کرو

اپنی عظمت کی تسّلی کے لئے
میری ذِلّت کو اشتہار کرو



سانسوں کا ساز دے کر احساس میرا لُوٹا
یہ زندگی کا شاید مجھ پر ستم ہے لُوٹا

لوگوں کے کان میں تو سیسہ بھرا ہُوا ہے
کیوں دِل کی سرزمیں سے شکوؤں کا شہر پھُوٹا

ہم نے تو موت سے بھی کرنی وفا تھی یارو
کیوں ہاتھ اس کا آ کر ہاتھوں سے میرے چھُوٹا

ہمدردیوں کا مرہم کب تک نہ زہر بنتا
سینے میں پھل رہا ہے محرومیوں کا بُوٹا

جن کے لئے نظر کے دیئے عمر بھر جلائے
دیکھو تو کہہ رہے ہیں وہی آج ہم کو جھُوٹا



سینے میں لئے تیرا پیار چلے
ہم جیت کے بازی ہار چلے

تو رسوا نہ ہو بدنام نہ ہو
یہی سوچ کے ہم سو بار چلے

اب آزادی سے لٹ جانا
ہم موت سے کر اقرار چلے

کیا پوچھتے تم سے یہ کیا کیا
ہے کافی کہ ہو کر خوار چلے

دنیا کی شکایت کس منہ سے
تیرے بھی تو ہم پروار چلے

ضد تیری ہی جیتی ہم ہارے
لے چھوڑ بھی دے تکرار چلے

تیرے ساتھ بھی رہ کر کیا پایا
جانا تو نہ تھا ناچار چلے

تیری نفرت زندہ رہ جائے
ہم اُلفت سے بیزار چلے

اے خضر مُبارک ہو تجھ کو
آ دیکھ سُوئے منجھدار چلے

○



زندگی میں ہی مر گئے ہم لوگ
کیا کہیں خود سے ڈر گئے ہم لوگ

درد کی آڑھی ترچھی راہوں میں
ایسے سمٹے بکھر گئے ہم لوگ

ڈھونڈنے پر نشان بھی نہ ملا
آج ہی اپنے گھر گئے ہم لوگ

آپ کو عظمتیں مبارک ہوں
ذلتوں میں نکھر گئے ہم لوگ

آپ سے محسنوں کی خواہش پر
زہر میں بھی اُتر گئے ہم لوگ

آپ شکووں کا کاسہ لے آئے
خامشی میں بکھر گئے ہم لوگ

آپ ایفائے عہد لائے جب
خواہشوں سے گزر گئے ہم لوگ

لمحوں کا دُکھ



وقت نے ہم کو اِس قدر لُوٹا
دِل کے مَندر کا دیوتا ٹُوٹا

خُود پہ اَب اعتبار کیسے کریں
تیرا ہر لفظ جب ہُوا جھُوٹا

آنکھ میں ہم نے جڑ لئے پتھر
درد کا ساتھ اِس طرح چھُوٹا

ڈر گیا دیکھ کر میری ہستی
مجھ سے یُوں موت کا خدا رُوٹھا

کر گیا اِس طرح کوئی گھائل
خُون بھی سانس سانس سے پھُوٹا



میں تو تڑپا ہوں صدا کی مانند
تو ہی بے حس تھا خدا کی مانند

مقبرہ میری ہی ہستی تو نہ تھی
تو بھی مردہ تھا قضا کی مانند

میں تو آتا ہوں ترے ملنے کو
تو ہی ملتا ہے جدا کی مانند

میں منانے تو نہیں آؤں گا
روٹھتے کیوں ہو خفا کی مانند

میں سمندر کی طرح ہوں خاموش
تو تھا چلاتی ندا کی مانند

مَیں وفاؤں کی صلیبوں کا یقیں
خُوش رہے تو ہی جفا کی مانِند

آیا رنگوں کا بیوپاری آیا
چل دے بے رنگ ہوا کی مانِند

میں تو مُجرِم کی طرح زِندہ ہوں
مِل بھی لے مجھُ سے سزا کی مانِند

تیری تو آنکھوں کے اُجڑے معبد
میں شِکستہ ہوں دُعا کی مانِند

تُم ترازُو کی عِلامت تو بنو
تُل ہی جاؤں گا گُناہ کی مانِند

تیرے چھونے نے ہے پتھرایا مجھے
چلنا تھا مجھ کو بلا کی مانند

میں ہی ماتم کا مصوّر تو نہیں
تو بھی اُجڑا تھا خلا کی مانند

جانتا ہوں کہ نہیں زندہ تو
مجھ کو مٹنا ہے فنا کی مانند



تُو جو آیا ہے شوالوں کی طرح
مِٹ گیا کوئی خیالوں کی طرح

برف ہونا مجھے منظُور نہ تھا
میں بجُھا بھی تو مشالوں کی طرح

اُس کو بھی بات نہ کرنی آئی
رہ گیا میرے سوالوں کی طرح

روتے رہ جاؤ گے مجھُ سے مِل کر
میری آواز ہے نالوں کی طرح

آؤں گا میں بھی کبھی کام تیرے
رکھ ہی لے مجھُ کو حوالوں کی طرح

تم ہی اجڑے نہیں اس بستی میں
لٹ گیا میں بھی جیالوں کی طرح

تم جو تاریخ لکھو گے اپنی
مل ہی جاؤں گا مثالوں کی طرح



اِس نگری میں کیسا سُکھ
بیتے لمحے جلتے دُکھ

خُوشیوں کی برسات بھی کیوں
سُوکھ چلا اَب جیون رُکھ

تُو بھی آئے چیخ پڑے
پہچانا نہ جائے مُکھ

آشا کے مت دِیپ جلا
بانجھ ہوئی بھگوَن کی کُکھ

پتھر آنکھیں چُپ کے ہونٹ
لوگ کہیں مجھ کو ہنس مُکھ



کوئی اُلفت کوئی نفرت کا نِشاں
اے دلِ ویران لے آیا کہاں

میرے گھر آئے ہو یارو کس لئے
وحشتیں ہی وحشتیں ہوں گی یہاں

نفرتو! تم تو نہ جاؤ چھوڑ کر
مِٹ چکا میری مُحبّت کا نِشاں

پھوڑ ہی دیں آنکھ کے شیشے کو ہم
کر گیا وا جو تھا سینے میں نہاں

درد کے وِیراں نگر کو ڈھونڈتا
جا رہا تھا حسرتوں کا کارواں

جس ڈگر پہ اُس کو آنا ہی نہیں
منتظر آنکھیں لئے بیٹھے وہاں

میری چاہت تیری اُلفت کا نقیب
کھو گیا جانے کہاں پر وہ سماں



صُبح کا تارا ہم کو کچھ ایسی شبیہہ دِکھلا گیا
دے کے اُجیارے جہاں کو خُود فنا کو بھا گیا

اپنے ہی پنجے گڑھے ہوں اپنے ہی اَبدان میں
دُور کی کیا بات ہے وہ بھی زمانہ آ گیا

بھُول جائیں ظُلم کی رُت کھا لیں زہریلی ہوا
ہم سے دِیوانوں کو کوئی ایسے بھی سمجھا گیا

مُنجمِد بے حِس خُدا تھا جانے کیا اُس کو ہُوا
سِینے سے میرے لگا اور مجُھ کو بھی برفا گیا

دیکھ کر شعلے بھڑکتے آنکھ کے مندر میں آج
گھر کا کُہنہ پجُاری خوف سے تھرّا گیا

ہم نے تو دیکھیں تھیں یارو، رنگتوں کی دیویاں
درد کا اُجڑا شہر پھر آنکھ کو تڑپا گیا

موت کے ہونٹوں پہ رقصاں زِندگی کے گیت تھے
دیکھ کر ایسی خوشی کو دِل میرا دہلا گیا

چاند تو ڈُوبا تھا شب میں یہ بھی دیکھو مُعجزہ
دیکھ کر میرا مُقدّر شمس بھی گہنا گیا

تھا پُجاری ہی خزاں کا جو کہ آج
آنکھ کے وِیراں کھنڈر میں حسرتیں بِکھرا گیا



وُہ جو سُورج کی طرح تھا نِکلا
ایک پتھر بھی نہ اُس سے پگھلا

میں تو تکتا ہی رہا اُس کو فقط
رنگ اِس طور سے اُس نے بَدلا

اُس کو حسرت ہی رہی سننے کی
نہ کہا میں نے بھی کوئی جُملہ

راہ پہ زیست کی چلتے چلتے
اور ہی بِکھرا میں جتنا سنبھلا

میں تھا کتراتا جہاں جانے سے
لے ہی پہنچا وہیں یہ جی پگلا



لوٹ جائے نہ گھبرا کے چنچل ہوا
جانے ہنستا ہے کیوں آج پگلا خدا

میں نے سایوں کو ڈھونڈا تو صحرا ملے
اِس کڑی دھوپ میں ہو کوئی آشنا

آپ تو میکدے میں بھی اُجلے رہے
ہم ہی مارے گئے خواہ مخواہ بیگناہ

آپ تو ظلم کی زندہ تصویر ہیں
کون مانگے بھلا آپ سے آسرا

اِس کو بھی کچھ تڑپنے کا احساس ہو
آج پیاسا رہے دوستو مے کدہ



خواہشوں کے لئے یہ دہر نہیں
تیرگی کی جبیں پہ مہر نہیں

آنکھ میں جلتی آرزوئیں ہیں
درد کے ناگ تجھ میں زہر نہیں

حسرتوں کا مزار مت پوچھو
اجڑے لوگوں کا کوئی شہر نہیں

آج کیوں خامشی سے گزرا تو
تیرے ترکش میں کوئی قہر نہیں

زندگی نے ہمیں سکھایا یہی
غم کے آنے کا کوئی پہر نہیں



بُجھ گیا چاند گھٹاؤں کے سبب
لُٹ گیا پیار وفاؤں کے سبب

صدیوں سے سوچ میں ہوں ڈوبا ہُوا
اُجڑا ہُوں کس کی اداؤں کے سبب

درد کا دیپ بجھا چاہتا تھا
جل اُٹھا ان کی جفاؤں کے سبب

جان تو پیار نے لے لی یارو
اُڑ گیا گھر بھی ہواؤں کے سبب

مر گیا سوچ کا مجُرم سُن لو
اَندھے بے بہرے خُداؤں کے سبب

اُس کو پہچان نہ پائے ہم بھی
آنکھ میں ٹھہرے خلاؤں کے سبب

لوگ گرتے گئے زمیں کی طرف
زہر میں بُجھتی فضاؤں کے سبب



ساحل سے بے نیاز بھنور میں سما گئے
ہم کیا کہیں کہ آپ کی نظروں میں آ گئے

آئے تھے دو گھڑی کے لئے میرے پاس وہ
آنکھوں کو شہرِ برق کا نقشہ دکھا گئے

ہم اب بھی خود کو ڈھونڈ رہے ہیں خلاؤں میں
کچھ اِس طرح وہ ہم کو نظر سے گرا گئے

ہم بھی کبھی تھے اُن کی محبّت کی آرزو
جو آج بے رُخی سے نگاہیں چُرا گئے

وہ میرے پیار اپنی اداؤں کے کھیل کو
ماضی کا کوئی خواب سمجھ کر بھلا گئے



بانجھ پن میرا مقدّر زِندگی سُنسان ہے
وقت کے ہونٹوں پہ دبکا موت کا اعلان ہے

ڈھُونڈتے کیا ہو بتاؤ تم بدن کے غار میں
سانس کی جلتی چِتا کا آنکھ میں شمشان ہے

کاغذی خُوشیوں پہ نازاں ہوں اگر تو کس لئے
غم کی سنگینوں کی زد میں آج بھی انسان ہے

مُعجزہ اس کو کہوں یا اپنی نظروں کا فسُوں
پتھروں کی آنکھ میں پھیلا ہوا طوُفان ہے

کون ہے خود آج اپنی لاش پہ ماتم کناں
کِس کے ہونٹوں پر مچلتی موت کی مُسکان ہے



سنگینوں کے شہر مجھے کچھ کہنا ہے
ڈھا لینا پھر قہر مجھے کچھ کہنا ہے

سکھ کی باتیں افسانوں کا شہر ہوئیں
دکھ کے جلتے پہر مجھے کچھ کہنا ہے

روشنیوں میں بھی اندھیارے جلتے رہے
سن صبحوں کے دہر مجھے کچھ کہنا ہے

راج ترے میں تارے ڈوبے دن نہ ہوا
بجھ گیا جلتا مہر مجھے کچھ کہنا ہے

تو حاکم انجام میرا مقتل ہی سہی
اے زہریلی لہر مجھے کچھ کہنا ہے



میں نے اِنسان میں بھگوان کی چھَب دیکھی ہے
پیار میں بھیگی ہوئی شان کی چھَب دیکھی ہے

بھُوکی نظروں کے ترازُو میں جو تُلتی ہی گئی تُلتی رہی
اُسی عِصمت میں لُٹی آن کی چھَب دیکھی ہے

ظُلم کے گاؤں کھے دِل کی جبِیں کیسی کتھا
زہر میں بُجھتے ہوئے بان کی چھَب دیکھی ہے

زَر کی وادی کے گُنہگار خداوندو سُنو
میں نے ہمینت پہ لگے کان کی چھَب دیکھی ہے

اے مہا پُرش کھُلی آنکھ سے گر دیکھو تو
تیری روتی ہُوئی سنتان کی چھَب دیکھی ہے

صدیوں کے نام!

سوگ میں ڈوبی ہوئی زہر صلیبوں کی قسم
شہرِ ماتم تیرے دربان کی چھب دیکھی ہے

آج پھر پیار کی بستی میں دھماکا سا ہوا
اُسی دوپہر کے مہمان کی چھب دیکھی ہے

آج میں پِستے ہوئے کاغذی اِنسانوں کی
ضبط میں مرتی ہوئی جان کی چھب دیکھی ہے

ظُلمتِ شہر پہ ہے طاری نِزاع کا عالم
جانے سُورج تلے زِندان کی چھب دیکھی ہے

کوئی راون کے مُقدّر کی طرح مسخ ہُوا
میں نے یوُں جہل کے عرفان کی چھب دیکھی ہے

اب تو جیون بھی کبھتا رنگ ہوا جائے ہے
میں نے ہر گام پہ سمشان کی چھب دیکھی ہے

برفزاروں کے مقدّر کی طرح بے حس ہیں
کس نے شعلوں پہ یہ بہتان کی چھب دیکھی ہے



نِگاہوں میں شُعلے پروئے تو جانا
دُھواں رہ گیا ہے ہمارا ٹھکانا

مُحبت سے ہم نے جو باہیں پھیلائیں
تو نفرت کا دل پہ لگا تازِیانہ

کوئی بارہا مُجھ سے پُوچھے یہ آ کر
کہاں کھو گیا ہے ترا مُسکرانا

اندھیری اُمیدیں ہیں اِک کہانی
اُمنگوں کے خوں سے مُقدّر جلانا

جہاں رسم پُوجا نہ کاہن کے پہرے
خلاؤں کے معبد میرا آشیانہ



لخنت پاشا کے نام

ہو گیا خُود سے بھی جُدا لوگو
تھا جو سب کے لئے دُعا لوگو

پیار کی بستیاں اُجڑنے لگیں
اب نہیں کوئی راستہ لوگو

روشنی کے جنوں میں اندھے ہوئے
دِن بھی کہنے کو یُوں چڑھا لوگو

دِل کی دُنیا میں پھر خلا جاگا
کون محفل سے یُوں اُٹھا لوگو

رات کے ہونٹ سے خُوشی پھُوٹی
صُبح کا تارا بھی مَر گیا لوگو



اُجڑے ہوئے یہ سپنے ہیں بھی ارمان تھا کبھی
صحرا میں ڈھل گیا ہے جو طوفان تھا کبھی

محرومیوں کے تیر چلاؤ گے اب کہاں
پتھرا گیا وہ شخص جو انسان تھا کبھی

سوچوں کے گہرے غار میں وہ بھی لُڑھک گیا
جو بے کسی کے نام سے انجان تھا کبھی

خود چیخ بن گیا ہے جو اپنے وجود کی
تیرے گلاب ہونٹوں کی مُسکان تھا کبھی

زندہ رہوں گا زیست پہ اِلزام کی طرح
اب کیا کہوں کہ اِتنا بھی نادان تھا کبھی



برف کا شہر اور میری چُپ
آس کی لہر میں گھنیری چُپ

کب سے بیٹھا ہُوا یہ سوچے ہوں
مرگ کا ساز ہُوئی تیری چُپ

بات کرنی کسے نہیں آتی
لُوٹ کر لے گئی اندھیری چُپ

سامنے آئے موت میں اُترے
آج کے پہر میں دلیری چُپ

آ بھی جاؤ صنم نہ ڈرتے رہو
ہم نے ہر گام پہ بکھیری چُپ



خزاں آ کے ہم پہ نہ کیوں مُسکرائے
بہاروں نے آنکھوں کے منظر بُجھائے

ستاروں نے سانسوں میں پتھر پروئے
ہمارے لبوں کے جو در تھر تھرائے

کبھی چُپ کی سنگت نے آنکھیں دکھائیں
کبھی ہم نے لفظوں کے سائے اٹھائے

جہاں ہم نے شعلوں کی پرواز چاہی
وہیں برف کے جال اُس نے بچھائے

حقیقت کے پتھر سے کرچی ہوئے جو
ہمیں نے تھے شیشوں کے مندر سجائے



لوگ کہتے ہیں یارو کہ کیا مر گیا
درد جاگا خُوشی کا خُدا مر گیا

سوچ کے آسماں کو جو دیکھا دھُواں
طرَب بزموں کا سارا نشہ مر گیا

ذہن کے بادلوں کو پریشاں کرو
پھُونک دو کِشتیاں ناخُدا مر گیا

ہم کو جیون کی چاہت بھی کانٹا لگے
گوپیاں چیختی ہیں پیا مر گیا

آنکھ سے زِندگی کے اِشارے کرو
سانس کی دھڑکنوں کا شُبہ مر گیا

ظُلم بستی میں کہرام برپا ہوا
ضبط کا بے نوا سِلسِلہ مر گیا

نفرتوں کی اَدائیں جو دیکھیں حسیں
پربت کا دیوتا تھا بچا مر گیا



آگ کی دھار پہ چلنا سیکھو
اپنے ہی خون سے جلنا سیکھو

غم کے ماخذ سے اگر ملنا ہے
درد کے گاؤں میں ڈھلنا سیکھو

اپنی پہچان اگر کرنی ہے
شمس کی طرح نکلنا سیکھو

آج بھی صبح سے اگر الفت ہے
شمع کی طرح پگھلنا سیکھو

فتح کا نام اگر پانا ہے
رنگ چہرے کا بدلنا سیکھو